www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مارچ 2018

عالمی
یوم خواتین
مبارک

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

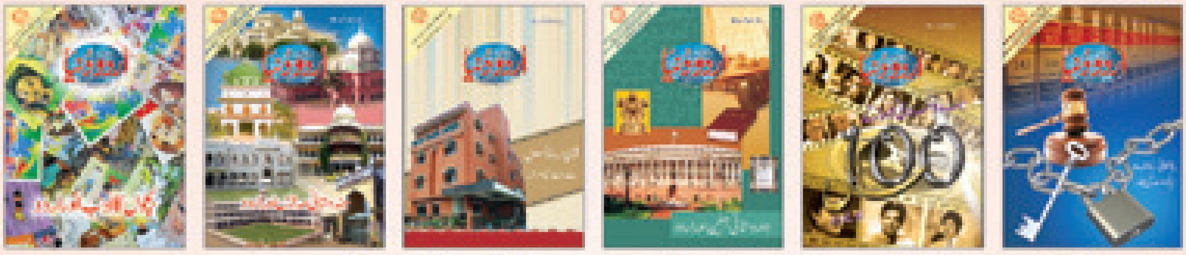

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے: اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 2 شمارہ: 3 مارچ 2018

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

نگارشات ارسال کرنے کے لیے ای میل: kduniya@ncpul.in

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

مشیر: شعیب رضا فاطمی

فہرست

اداریہ

مکالمہ — مدیر — 4

روبرو

ڈاکٹر نصرت مہدی سے گفتگو — شعیب رضا فاطمی — 5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 8

جہان نسواں

بچوں کے افسانوی ادب...... — سید اسرار الحق — 9

صغرا مہدی اور پہچان — کہکشاں یاسمین — 13

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی — درخشاں تاجور — 16

حیدرآباد میں جنگ آزادی — سیدہ جعفر — 20

قانون میں خواتین

خواتین کے خلاف خانگی تشدد........ — خواجہ عبدالمنتقم — 24

کہانیاں

حد چاہیے سزا میں — لائی چودھری — 28

ہوئے کیوں نہ غرق دریا — خورشید جہاں — 32

کون بنے گا کروڑ پتی — شاہدہ صدیقی — 36

بستی بستی کا جال — نفیس بانو شمع — 42

شبنم کی تپش — احساس نایاب — 45

زباں پہ درد بھری...... — سیدہ تبسم منظور ناڈکر — 47

حسن سخن

کشور آرا شبنم، سیدہ شان معراج 49، ثمینہ مشتاق، عمرانہ خانم 50

مینا نقوی 51، عزیز بانو داراب وفا 52

باورچی خانہ

لذیذ پکوان — 53

صحت

معلومات صحت و تندرستی — 55

آرائش و زیبائش

چہرے کا حسن نکھارنے........ — 59

تاثرات: گھر گھر سے — 61

قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

مقام اشاعت و صدر دفتر: فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066 فون: 26109746 فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، چھتہ گلی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مکالمہ

مارچ عالمی یوم خواتین ماہ کے طور پر ساری دنیا میں نہایت جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ایک طویل عرصے تک خواتین کو حاشیے میں رکھنے کے بعد بالآخر مرد اساس سماج نے یہ محسوس کرلیا کہ دنیا کی اس آدھی آبادی کو نظرانداز کرنے سے سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہیں ہونے والا ہے۔ ہمارے ملک میں دیر سے ہی سہی لیکن اب نہایت سنجیدگی سے خواتین کی محرومیوں کے ازالے کی کوشش سماجی سطح پر بھی اور حکومتی سطح پر بھی ہورہی ہے اور اس کے بہتر نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔ معاشرے میں اب خواتین کے مسائل پر نہایت سنجیدہ گفتگو ہونے لگی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ خواتین کی وہ محنت ہے، جو ہمیں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔اب صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ معاشرے کے ہر شعبۂ حیات میں جہاں خواتین کو ذمہ داری دی گئی وہ اسے نہایت خوش اسلوبی سے نہ صرف انجام دیتی ہیں بلکہ ان کا حسن انتظام اتنا اچھا ہوتا ہے کہ اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ہماری حکومت بھی اس سلسلے میں نہایت سنجیدہ ہے۔غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ گذشتہ ایک دہے میں ہندوستانی خواتین کے حقوق اور اس کے تحفظ کی جتنی کوششیں سرکاری سطح پر ہوئیں ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ذہنی سطح پر ہمارے ملک میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں تبدیلی کا عمل نہایت سست رفتار ہوا کرتا ہے اور ایک ایسا مسئلہ جس کی بنیاد معاشرے سے لے کر مذہب تک کی جڑوں میں پیوست ہوں اسے حل کرنا اور پوری طرح حل کرنے میں وقت تو لگے گا۔اس کام کے لیے نہ صرف حکومت بلکہ سماجی طور پر بھی ہر فرد و بشر کو اپنی ذمہ داری سمجھنی ہوگی۔ خواتین کی جو شبیہ گذشتہ صدیوں میں ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے وہ آدھی ادھوری تصویر ہے اور اسے مکمل کرنے کی ذمہ داری ہماری ہے۔ خواتین کو ایک طرف ہم ماں، بہن، بیوی کے طور پر اپنے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں لیکن دوسری طرف اسے صرف ضرورت کی شے سمجھ کر اس کا استحصال بھی کرتے ہیں۔اس دوہرے رویے کی وجہ سے ہی پورا معاشرہ افراط وتفریط کا شکار ہے۔ عورت ماں ہے اس حقیقت سے انکار نہیں تو پھر ہماری اور تمھاری ماں کیا ہے؟ اگر بہن ہے تو ہے اور اس کے تحفظ کی ذمہ داری پورے معاشرے کی ہے۔ آخر کیوں اپنے گھر کی چہاردیواری سے نکلتے ہی ایک ماں، ایک بہن، ایک بیٹی غیر محفوظ ہوجاتی ہے؟ وہ لوگ جو راہ چلتی خاتون کو صرف ایک عورت سمجھ لیتے ہیں وہ لمحہ بھر کو بھی یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اس کائنات کی سب سے حسین مخلوق کو اگر انسانوں کی بھیڑ کے درمیان تحفظ فراہم نہ ہو تو یہ انسانیت کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان ہے۔صبر و شکر، ایثار و قربانی اور مردوں کو ایک حسین جنت نما گھر اور ان کی نسل کو آگے بڑھانے والی اولاد دینے والی عورت کو اگر یہ سماج عزت نہ دے سکے، اس کے حقوق سلب کیے جائیں اسے دوسرے اور تیسرے درجے کا شہری قرار دیا جائے تو ایسے سماج کو کیا نام دیا جائے اس کا فیصلہ آپ خود کرسکتے ہیں۔

عالمی یوم خواتین کے اس موقع پر ایک طرف میں دنیا کی تمام خواتین کو مبارک باد دیتا ہوں تو دوسری طرف ساری دنیا کے ان مردوں سے گذارش کرتا ہوں جو عورتوں کو کہیں نہ کہیں خود سے کمتر سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے ذہن ودل کو کشادہ کریں اور خدا کی اس سب سے حسین باوقار سکون بخش عزم وہمت کی پیکر ایثار و قربانی کی مجسم تصویر مخلوق کو صرف زینت محفل نہیں بلکہ زینت دنیا قرار دیں اور یہ عہد کریں کہ وہ اپنے معاشرے میں خواتین کے تحفظ کو اسی طرح یقینی بنائیں گے جیسے اپنے کسی انمول خزانے کی حفاظت کرتے ہیں اور یہی وہ عہد ہوگا جس کے عمل پیرا ہونے کے بعد ہمارا معاشرہ جنت کا نمونہ بن جائے گا۔

'خواتین دنیا' کے قارئین! آپ سب کو اس نہایت اہم موقع پر یہ عہد لینا چاہیے کہ ہم اپنے اپنے گھروں میں اپنے بچوں کے درمیان جنسیت کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کریں گے اور اگر آپ اس عہد کو نبھا پائیں تو پھر آنے والی نسل نہایت خوش باش ہوگی۔اس نسل کے لیے سلسلے ہماری جانب سے یہ ایک بہترین تحفہ ہوگا کہ ان کی نسل میں اور ان کے دور میں معاشرہ انسان اساس ہوگا مرد اساس یا خاتون اساس نہ ہوگا۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

شعیب رضا فاطمی

معروف شاعرہ
ڈاکٹر نصرت مہدی سے گفتگو

معروف شاعرہ ڈاکٹر نصرت مہدی اردو کی معروف شاعرہ ہیں۔ نہایت سنجیدہ تخلیق ہونے کے ساتھ ساتھ زبان وادب کی سنجیدہ قاری بھی ہیں۔ زبان وادب کے فروغ کے لیے ان کی کوششوں کو اردو دنیا میں سراہا جاتا رہا ہے۔ فی الوقت وہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری ہیں۔ گذشتہ دنوں وہ قومی کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرے میں شرکت کرنے تشریف لائی تھیں۔ اسی موقع پر ان سے کی گئی ایک گفتگو قارئین کے لیے پیش ہے۔

سوال: آپ کا مکمل اسم گرامی کیا ہے؟

جواب: ڈاکٹر نصرت مہدی

سوال: آپ بحیثیت شاعرہ کیا تخلص فرماتی ہیں؟

جواب: کوئی نہیں

سوال: آپ کے والد صاحب کا اسم گرامی کیا ہے؟

جواب: سید التجا حسین زیدی

سوال: آپ کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی؟

جواب: محترمہ گوہر بانو

سوال: آپ کی پیدائش کس شہر میں ہوئی؟

سوال: نگینہ، اتر پردیش

سوال: آپ کا قیام کہاں کہاں رہا؟

جواب: نگینہ، نوئیڈا، بھوپال

سوال: کیا اپنی تعلیمی سفر کے بارے میں بتانا پسند فرمائیں گی؟

جواب: ایم اے انگلش، ہندی اور اردو، ڈاکٹریٹ اشکروفٹ یونیورسٹی لندن سے

سوال: اردو شاعری کا شوق کیسے ہوا؟

جواب: خاندان میں کئی چچا شاعر تھے دادی اور چار بہنیں شاعرات اور نثر نگار تھیں اور ہیں۔ گھر کے ادبی ماحول سے اردو زبان وادب اور شاعری میں بچپن سے ہی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔

سوال: کیا آپ کے خاندان میں کسی اور کی بھی وجہ شہرت شاعری ہے یا رہی ہے؟

جواب: جی جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا میری چار بہنیں اس وقت بھی شاعری کے میدان میں سرگرم عمل ہیں اور انھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔

سوال: شاعری میں کس سے شرف تلمذ حاصل ہوا؟

جواب: ابتدا میں گھر میں ہی بہنیں اصلاح کرتی رہیں پھر شادی کے بعد میرے سسر مشہور ومعروف فکشن رائٹر، نقاد اور شاعر جناب مہدی جعفر صاحب سے بھی رہنمائی حاصل ہوئی۔

سوال: ذہن رسا میں جذبہ سخنوری یا شاعری کا شعور کب جاگا؟

جواب: 14 برس کی عمر میں پہلا شعر کہا تھا جس کے کہنے کے بعد محسوس ہوا کہ ذہن ودل میں شاعری کا شعور بیدار ہو چکا ہے۔

سوال: آپ بنیادی طور شاعری کی کون سی صنف کو پسند کرتی ہیں؟

جواب: شاعری میں غزل میری پسندیدہ صنف ہے۔

سوال: اپنے کلام کا پہلا شعر عطا کیجیے۔

جواب: 14 سال کی عمر میں ایک دن میں ایک شعر اور ایک قطعہ ہوا تھا، ان میں سے قطعہ یہ ہے

ہم نے سوچا ہے زمانے کا کہا کیوں مانیں
طے شدا زندگی جینے کی ادا کیوں مانیں
آسمانوں کی بلندی پہ بھی حق درج کیا
یہ زمیں ہم سے نہ سنبھلے گی بھلا کیوں مانیں

سوال: اپنی پسند کا کوئی شعر

جواب:

جب اس کا کوئی داؤ مجھ پہ کارگر نہ ہو سکا
تو یہ ہوا کہ وہ مری سپردگی میں آ گیا

مجھے اپنا یہ شعر بھی بہت پسند ہے

میں کیا کروں کہ تیری انا کو سکوں ملے
گر جاؤں ٹوٹ جاؤں بکھر جاؤں کیا کروں

سوال: قدیم اساتذہ شعرا کرام میں سے آپ کس سے متاثر ہیں یا کس کی شاعری کے معترف ہیں؟

جواب: رومی، غالب، اقبال، پروین شاکر، شہریار، عرفان صدیقی، تاج بھوپالی

سوال: دور جدید میں کسی اردو شاعر یا شاعرہ کے کلام کے معترف ہیں؟

جواب: گلزار، جاوید اختر، عباس تابش، عشرت آفرین، حمیرا رحمان، ڈاکٹر بینا نقوی

سوال: کیا آپ صاحب دیوان ہیں؟

جواب: جی ہاں میرے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں

سوال: آپ کا کلام پہلی مرتبہ کہاں شائع ہوا؟

جواب: پہلی مرتبہ میرا کلام 14 برس کی عمر میں بجنور ٹائمز نام کے اخبار میں شائع ہوا تھا۔

سوال: آپ نے کون کون سے قابل ذکر مشاعروں میں کہاں اور کب شرکت فرمائی؟

جواب: دنیا کے ان تمام ممالک کے اہم مشاعروں میں شرکت کر چکی ہوں جہاں اردو کے مشاعرے منعقد ہوتے ہیں امریکہ، کویت، بحرین، قطر، دبئی، مسقط، پاکستان، سعودی عرب کے ممالک قابل ذکر ہیں۔

سوال: آپ اردو کے علاوہ کس زبان میں طبع آزمائی فرماتی ہیں؟

جواب: اردو، ہندی اور انگریزی میں شاعری اور نثر دونوں میں میرا کلام ہے۔

سوال: فارسی شاعری اور کلام سے کس حد تک لگاؤ ہے؟

جواب: فارسی شاعری سے بے حد لگاؤ ہے لیکن ابھی تک ترجمے سے ہی استفادہ حاصل کر رہی ہوں فارسی کو براہ راست پڑھنے کا ارمان بہت ہے لیکن مصروفیت کی وجہ سے سیکھ نہیں پائی ہوں۔

سوال: برصغیر پاک و ہند میں بننے والی فلموں میں گذشتہ 80 برس میں شاعری کو قابل رشک عروج اور بے پناہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ فلمی شاعری کے اس اعلیٰ معیار پر تبصرہ فرمایئے۔

جواب: فلمیں کم دیکھتی ہوں اس لیے بہت علم نہیں ہے لیکن ہندوستانی فلموں، مغل اعظم رضیہ سلطان اور امراؤ جان کی غزلیں اور گیت بے پناہ پسند ہیں۔ ان فلموں میں شکیل بدایونی کیفی اعظمی کیف بھوپالی ندا فاضلی شہریار وغیرہ نے گیت اور غزلیں لکھی تھیں جو ہر طرح سے شاعری کے معیار پر کھری اترتی ہیں اس دور تک اردو زبان اور شاعری کے بغیر ہندوستانی فلموں کی کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ہمارے اردو شاعر بھی زبان اور شاعری کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے لیکن اب وقت بدل گیا ہے فلموں میں اردو زبان اور شاعری کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی نہ ہی وہ معیار بچا آئٹم سونگس اور تک بندیاں کامیاب ہو رہی ہیں فلمی گیتوں کی بات کریں تو یہ شاعری کے زوال کا دور ہے۔

سوال: آپ نے حمد اور نعت لکھنے کی سعادت بھی ضرور حاصل کی ہوگی حمد اور نعتؐ کے اشعار عطا کیجیے۔

جواب: ایک حمدیہ نظم

جو تو نے اک لفظ کن کہا تھا
وہ اب بھی خلقت کا ماحصل ہے
تمام سناٹے بولتے ہیں
زمین پھولوں کی خوشبوؤں سے مہک رہی ہے
تمام برگ و شجر بھی تیری ثنا میں مصروف ہو گئے ہیں
ہوائیں اترا رہی ہیں خود پر طیور گویا ہوئے ہیں تو ایسا لگ رہا ہے
کہ جیسے بارش کی پہلی خوشبو نہیں ملی ہے
فقط حقیقت ہے ذات تیری
کہ تو نے سب کو ادائیں بخشیں
مجھے بھی یا رب
طلسم گویائی کا عطا ہو

سوال: آپ کی صاحب رائے میں آج کل مشاعروں میں شرکت کرنے والے سامعین کرام کی داد و تحسین کا معیار کیا ہے؟

جواب: مشاعروں کے حالات تو اچھے نہیں ہیں عوامی مشاعروں میں 80% داد و تحسین قوالی کی طرح ترنم سے کلام پیش کرنے پر، حالات

حاضرہ اور سیاست پر غیر معیاری طنزیہ شاعری پیش کرنے پر، اور مزاح کے نام پر لطیفے پیش کرنے پر دی جارہی ہے۔ بیس فیصد لوگ اب بھی شاعری سننا چاہتے ہیں ایسے سامعین کے لئے منعقد ہونے والے مشاعروں کی تعداد بہت کم ہے لیکن یہ 20% مشاعرے بھی بہت مقبول اور کامیاب مشاعرے ہوتے ہیں ان مشاعروں میں سنجیدہ اور معتبر شعرا کو ہی مدعو کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے ان میں سامعین بھی باشعور سخن فہم، سخن شناس اور سنجیدہ مزاج ہوتے ہیں جو اچھی شاعری کی بھرپور پذیرائی کرتے ہیں۔

سوال: مختلف اصناف سخن مثلاً غزل، نظم، مرثیہ، گیت دوہے اور مثنوی پر طبع آزمائی کرنے والے قدیم اور جدید اساتذہ کرام کے کلام میں سے اپنی پسند کے کچھ اشعار اگر آپ کو یاد ہوں تو

جواب: گلزار کی ایک نظم

نظم الجھی ہوئی ہے سینے میں
مصرعے اٹکے ہوئے ہیں ہونٹوں پر
لفظ کاغذ پہ بیٹھتے ہی نہیں
اڑتے پھرتے ہیں تتلیوں کی طرح
کب سے بیٹھا ہوا ہوں میں جانم
سادہ کاغذ پہ لکھ کے نام ترا
بس ترا نام ہی مکمل ہے
اس سے بہتر بھی نظم کیا ہوگی

ندا فاضلی کا دوہا

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی بن چٹھی بن تار

میر انیس کے مرثیے کا ایک بند

آج شبیرؑ پہ کیا عالم تنہائی ہے
ظلم کی چاند پہ زہرا کی گھٹا چھائی ہے

اس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے
یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے

برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو ہے شور ستمگاروں میں

سوال: اقلیم سخن کے بے تاج بادشاہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کا کوئی ایک شعر

جواب:

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

سوال: علامہ اقبال کا کوئی ایک پسندیدہ شعر

جواب:

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

سوال: اپنے پسندیدہ شاعر کا کوئی ایک شعر

جواب: پسندیدہ شاعرہ کا شعر
پروین شاکر

ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی اس نے کمال کر دیا

سوال: نوجوان نسل کے شاعروں اور شاعرات کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے؟

جواب: نوجوان نسل سے یہی کہنا ہے اچھا ادب پڑھنے کی عادت ڈالیں کتابوں سے رشتہ پوری طرح ختم نہ کریں ادب میں مقام حاصل کرنے کے لئے cutshort تلاش نہ کریں صلاحیتوں کو آزمائش کی بھٹی میں تپنے دیں سونا بن جائیں گے۔

فرہنگ آصفیہ سے

زاویہ- ع۔ اسم مذکر۔ کونا۔ گوشہ۔ کھونٹ۔ مخالف سمتوں سے دو مستقیم خطوں کے ایک نقطہ پر ملنے سے جو کونہ پیدا ہوا سے زاویہ کہتے ہیں۔ اقلیدس میں زاویہ کی مشہور قسمیں یہ ہیں زاویہ مسطحہ جو دو مستقیم خطوں کے ایک نقطہ پر ملنے سے پیدا ہو بشرطیکہ وہ دونوں خطوط مل کر ایک مستقیم خط نہ ہو جائیں۔ زاویہ مستقیم الخطین جو سطح مسطوی پر دو خط کے ملنے سے پیدا ہو۔ زاویہ قائمہ۔ وہ جو ایک خط مستقیم پر دوسرا خط مستقیم اس طرح واقع ہونے سے کہ اس خط کے دونوں جانب برابر کے زاویے پیدا ہوں ظہور میں آئے۔ یہ ہر ایک قائمہ کہلائیگا زاویہ منفرجہ یعنی فراخ کونہ جو قائمہ سے بڑا ہو۔ زاویہ حادہ یعنی تنگ کونہ جو قائمہ سے چھوٹا ہو۔

باپ مارے کا بیر۔ ف۔ محاورہ۔ (۱) قدیمی۔ عداوت (۲) نہایت دشمنی۔ وہ عداوت جو بزرگوں سے چلی آئے۔ خاندانی عداوت۔

شاعرات کے منتخب اشعار

بارشیں جاڑے کی اور تنہا بہت میرا کسان
جسم اور اکلوتا کمبل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

دستِ ہوا نے جیسے درانتی سنبھال لی
اب کے سروں کی فصل سے کھلیان پٹ گئے

پروین شاکر

مجھے شریکِ بہاراں کیا ہے ٹھہرو تو
میں اپنے خوں میں نہا کر ذرا نکھر جاؤں

یہ حرف چند بھی اک عمر کی کمائی ہیں
کہ قربتیں ہی وراثت میں ہم نے پائی ہیں

عشرت آفرین

نہ ٹوٹ جائیں کہیں حوصلے اڑانوں کے
قفس سے دور پرندوں کے بال و پر رکھنا

فصیلِ شہر پہ ٹھہرے ہیں اجنبی سے پرند
یہ لگ رہا ہے کہ موسم بدلنے والا ہے

ملکہ نسیم

کچھ اپنے گھر کی فصیلوں سے بدگماں ہوں میں
کچھ عادتاً بھی مہاجر ہوں بے مکاں ہوں میں

نئی وضعوں کے گھر، رشتوں کی آرائش سے نالاں ہیں
سو رکھ دیں ساری تصویریں پسِ دیوار کیا کرتے

نسیم سید

سچ کہ تنقیدِ زندگی ہے ادب
شاعری نقدِ ذات ہے پنہاں

ذرا جو نیند سے چونکیں تو فطرت
سلائے خواب کا جھولا جھلا کر

سکینہ ساجد پنہاں

دل کی عمارت بنیادوں کے بیچ سے اکھڑی ہے
اب ہر کوئی تعمیروں سے پہلے سوچے گا

سب کو سطحِ آب پہ کھلتے کنول اچھے لگے
کس نے دیکھی ہے حمیرا جھیل کی گہرائیاں

حمیرا رحمٰن

یہ شہر دشت تھا تیرے ورود سے پہلے
دیارِ دل میں شگوفے کھلے نہ تھے ایسے

اس درجہ دل نواز تھی شہرِ وفا کی دھوپ
دل بے نیاز سایۂ دیوار ہو گیا

عرفانہ عزیز

یہ سمجھ کے چلتی ہوں تیرا نقشِ پا ہوگا
میں جہاں سے گزروں گی تیرا سامنا ہوگا

ہر اک قدم پہ کئی راستے بدلتا ہے
وہ کون ہے جو مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

مظفر النساء ناز

سید اسرار الحق

بچوں کے غیر افسانوی ادب میں خواتین کا حصہ

بچوں کے ادب میں عموماً کہانی، ناول، ڈراموں اور داستانوں کو افسانوی ادب اور باقی تمام نثری سرمائے کو غیر افسانوی ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔

غیر افسانوی ادب کا واحد مقصد محض بچوں کو تفریح بہم پہنچانا نہیں ہوتا، بلکہ کہانی کے پیرائے میں مناسب معلومات فراہم کی جاتی ہیں، غیر افسانوی اور معلوماتی ادب کا دائرہ بہت وسیع ہے، بچوں کی درسی و امدادی کتب کے علاوہ مختلف موضوعات پر مشتمل کتابیں شامل ہیں، جیسے: سوانح عمریاں، مکتوبات، مضامین، سفرنامے، سائنسی، سماجی، معلوماتی، تحقیقی اور تنقیدی کتب وغیرہ۔

بچوں کے ادب میں افسانوی اصناف ہر طرح حاوی رہے ہیں، اور بچوں کے لئے غیر افسانوی اور معلوماتی کتب بہت کم لکھی گئی ہیں، کیونکہ ہمارے ملک میں بچہ آنکھ کھولنے کے بعد پریوں اور جنوں کی کہانی سنتا ہے، ٹی وی سیریل میں بھی اسے حد درجہ روایتی قسم کی پریوں کی کہانیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، اسی خیالی دنیا میں بچوں کی ذہنی و جسمانی نشو ونما ہوتی ہے، جبکہ بیرونی ممالک میں افسانوی ادب سے زیادہ معلوماتی کتب کو اہمیت دی جاتی ہے، ہمارے ملک کے بچوں کو معلوماتی اور غیر افسانوی ادب کی شدید ضرورت ہے، بچوں میں تجسس کا مادہ فطری طور پر زیادہ موجود ہوتا ہے، جدید تعلیمی نفسیات اور سائنسی ترقی نے بچوں کے ذہن پر اثر ڈالا ہے آج کی سائنس کی دنیا نے بچوں کے ذہن کو بہت ترقی یافتہ بنا دیا ہے، چنانچہ وہ ہر اس چیز کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس کے سامنے آتی ہے یا جن کے بارے میں وہ منتظر رہتا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ بچوں کا غیر افسانوی ادب کمیت کے اعتبار سے کم ہے، اور اس میں بھی خواتین کے ذریعہ تحریر پانے والا ادب نہایت قلیل ہے، لیکن اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ادارتی سطح پر اس سلسلے میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی کے مصنفین کی خدمات نا قابل فراموش ہیں، حالیہ عرصہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ دہلی اور رحمانی پبلیکیشنز مالیگاؤں کی خدمات تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ مکتبہ جامعہ و پیام تعلیم نئی دہلی کی خواتین اہل قلم میں صالحہ عابد حسین، قدسیہ بیگم زیدی، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، پروفیسر انیس سلطانہ، صغری مہدی، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی اور ذکیہ ظہیر نے بچوں کے غیر افسانوی ادب کی بہترین آبیاری کی ہے، خصوصاً صالحہ عابد حسین کی خدمات بہت وقیع ہیں، انھوں نے ابتدا

میں بچوں اور بچیوں کے لئے ادبی اور معلوماتی مضامین بچوں کے رسالہ ''پیام تعلیم'' نئی دہلی کے لئے قلم بند کئے تھے، جن میں مندرجہ ذیل مضامین قابل ذکر ہیں: دست کاری، شملہ کی سیر، شملہ کے کتے، آپس کا برتاؤ، آپس

کا تناؤ، کشمیری بچے، راشٹر پتی، مولانا حالی بچوں کے ساتھ، بال ہٹ، بڑا مزا اس ملاپ میں ہے اور قومی خدمت وغیرہ۔

ان مضامین کے علاوہ ''سندر چنار'' اور ''ایک دیس ایک خون'' ایسی کتابیں ہیں جو بچوں میں حب الوطنی، قومی یکجہتی اور قومی یگانگت کا جذبہ پیدا کرتی ہیں، انھوں نے بچوں کے لئے ''باپو''، ''بڑا پانی''، ''بچوں کے حالی''، ''مورا'' اور ''زعفران پریوں کے دیس میں'' جیسی کتابیں بھی لکھیں، جن میں بڑا پانی (لیلا مجمدار) اور مورا (ملک راج آنند) دوسری زبانوں کے ترجمے ہیں۔

''ہم کماری'' صالحہ عابد حسین کی ایک معلوماتی کتاب ہے لیکن اس کا اسلوب کہانی کا ہے، یہ کہانی مصنفہ کی وطن دوستی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، ہم کماری اسی برف کی بیٹی ہے، جس نے ہمالیہ کے دامن میں جنم لیا، اور آنکھ کھولتے ہی ہندوستان کے حسین و پر جلال پہاڑوں کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتی ہوئی، اپنی زندگی کا طویل سفر کرتی ہوئی اور ہندوستانی زندگی کی جھلکیاں دیکھتی ہوئی فلسفہ حیات کو حقیقت کا جامہ پہناتی نظر آتی ہے۔

قدسیہ بیگم زیدی ایسی ادیبہ ہے جنھوں نے اپنے قلم کو صرف بچوں ہی کے لئے وقف کر رکھا تھا، انھوں نے بچوں کے لئے دوسری اصناف کے ساتھ معلوماتی مضامین بھی لکھے اور مغربی زبانوں کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے، بچوں کے رسالہ پیام تعلیم میں ان کے بے شمار معلوماتی مضامین بکھرے ہوئے ہیں، جو کہ سوانحی، تفریحی اور معلوماتی نوعیت کے ہیں، ان میں: کچھ پرواہ نہیں، راشٹر پتی، بڑے فن کاروں کی تصویریں اور شیر دادا وغیرہ اپنی افادیت کے اعتبار سے پڑھنے والوں کی توجہ بے ساختہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں، اور آج بھی ان مضامین کی افادیت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ''انوکھی دکان''، ''دنیا کے جانور'' اور ''گاندھی بابا کی کہانی'' ان کی اہم معلوماتی کتب ہیں۔

گاندھی بابا کی کہانی کا پیش لفظ یکم ستمبر 1952 کو پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا تھا جن کے بقول: ''اس کتاب میں رزمیہ داستان کی سی کیفیت ہے۔'' مہاتما گاندھی کی پوری سوانح عمری ان کی ماں کی زبانی مکالماتی انداز میں بیان کی گئی ہے، گاندھی جی کے بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک کے حالات، تعلیم و تربیت، خاندانی نیکی و شرافت، سماجی کشمکش، آزادی کی جد وجہد، قومی یکجہتی، سماج کی اصلاح و تربیت اور شہادت کے واقعات خاص ترتیب اور دل پذیر انداز میں بیان کئے گئے ہیں، کتاب کا ایک ایک لفظ گاندھی جی سے محبت و عقیدت کی روشنائی میں ڈبو کر لکھا گیا ہے، جو نوخیز نسلوں میں گاندھی جی کی محبت و عظمت، سماجی ظلم و استحصال، اونچ نیچ اور چھوت چھات کا خاتمہ کرنے، ان کے پیغام کو عام کرنے اور ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو پائے تکمیل تک پہنچانے کا احساس دلاتے ہیں۔

بچوں کی ایک مقبول اور ہر دل عزیز ادیبہ ڈاکٹر شفیقہ فرحت نے بچوں کے لئے کہانیوں اور ڈراموں کے علاوہ مضامین اور سوانحی کتابیں بھی لکھی ہے، وہ بچوں کی درسی کتب کی تدوین میں مہارت رکھتی تھیں، انھوں نے مدھیہ پردیش بھوپال بورڈ کے لئے بچوں کی پہلی اور تیسری جماعت کی اردو کتابیں مرتب کی ہیں، نیز ان کے مضامین وغیرہ بچوں کے نصابی کتب میں شامل ہیں، انھوں نے متنوع موضوعات پر مضامین لکھے ہیں، بچوں کے سوانحی ادب میں ان کی کتاب: ''بچوں کے نظیر اکبر آبادی'' سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے، جس میں انھوں نے اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کے فن اور شخصیت سے بچوں کو روشناس کرایا ہے، انھوں نے بڑے دل کش اور دل نشیں انداز میں اور بچوں کی اپنی زبان میں بچوں کو نظیر سے متعارف کرایا ہے۔

بچوں کے لئے ایسی تحریر وہی لکھ سکتا ہے جو بچوں کے مزاج سے بہ خوبی واقف ہو، شفیقہ فرحت کو بچوں سے طبعی مناسبت تھی، وہ بچوں کی سماجی اور تعلیمی سرگرمی سے وابستہ رہی ہیں، بچوں کی جیل اور رفار میٹری کی سربراہ رہی ہیں، بچوں کی جیل کو یہ بہت وقت دیتی تھیں، ملزم بچوں سے ان کی زندگی کی باتیں کرتی تھیں، اور ان کو قصے سناتی تھیں۔ (پروفیسر انیس سلطانہ۔ بچوں کی شفیقہ فرحت:23۔24)

بچوں کے سوانح ادب میں ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، ڈاکٹر صغریٰ مہدی، محترمہ ذکیہ ظہیر اور سیدہ سیدین حمید نے گراں قدر اضافہ کیا ہے، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے ''بچوں کے سردار جعفری'' اور ''بچوں کے یوسف ناظم'' نامی کتابیں تحریر کی ہیں، ان دونوں کتابوں میں مصنفہ نے سوانح نگاری کا حق ادا کر دیا ہے، علی سردار جعفری اور یوسف ناظم کے خاندانی، سماجی اور جغرافیائی حالات سے لیکر تعلیم و تربیت، ملازمت اور علمی وادبی کارنامے افسانوی انداز میں بیان کئے ہیں، جنھیں بچے شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر دم نہیں لے سکتے۔

ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے ''چنوں میاں'' (ڈاکٹر سید عابد حسین) اور ''بچوں کی آپا'' (گرڈ فلپس بورن) نامی کتب لکھی ہیں، ڈاکٹر عابد حسین بچوں اور بڑوں کے قلم کار، ڈرامہ نگار، صحافی، مترجم اور ادیب تھے اور بچوں کا رسالہ پیام تعلیم کے بانی تھے، آج بھی یہ رسالہ جامعہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے نکل رہا ہے، ''چنوں میاں'' میں ڈاکٹر سید عابد حسین کا بچپن، اسکول اور

کالج کی تعلیم، وظیفہ کا حصول، وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم، آکسفورڈ اور جرمنی کا سفر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بے لوث خدمات اور آزادی کی جدوجہد کی سچی اور پر خلوص داستان ہے۔

''بچوں کی آپا'' گرڈفلپس بورن کی کہانی ہے جو جرمنی سے جامعہ ملیہ تشریف لائیں، اور جامعہ ہی کی ہو کر رہ گئیں، جرمنی میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی زبانی انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی حسن کارکردگی اور اس کے قومی جذبہ کی باتیں سنی تھیں، خود آپا جان میں ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، وہ بار بار ذاکر صاحب سے جامعہ میں خدمت کے جذبہ کا اظہار کرتی تھیں، جسے ذاکر صاحب ٹال دیا کرتے تھے، ذاکر صاحب کے ہندوستان آنے کے بعد بھی خطوط میں وہ اس جذبہ کا اظہار کرتی رہیں، لیکن جامعہ کی مالی پریشانی کی وجہ سے ذاکر صاحب ہمیشہ ٹالتے رہے، ایک دن با لآخر وہ خود اپنا وطن اور خاندان چھوڑ کر جامعہ آ گئیں، اور نرسری، کنڈرگارٹن کلاسوں کی انچارج اور بچوں کے ہاسٹل کی اتالیق (وارڈن) مقرر ہوئیں، آپا جان نے جامعہ کے اسٹاف، بچوں اور بستی کی خواتین میں بہت جلد ہر دل عزیزی ہو گئیں، وہ گاندھی جی سے بہت عقیدت رکھتی تھیں، کھدر پہنتی تھیں، عید اور بقرعید کے موقع پر جامعہ کے بچوں اور خواتین کو سودیشی چیزیں اور کھلونے دیتی تھیں، انھوں نے زبان نہ جاننے کے با وجود اپنے چھوٹوں اور بڑوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، ہر ایک کے دکھ درد میں شریک رہتی تھیں، انھیں بچوں کی پرورش اور تربیت کے سلسلہ میں معمولی کام کرنے میں بھی کوئی عار نہیں ہوتا تھا، بچوں کا منہ دھلانا، سر میں تیل ڈالنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا، انھیں بچوں کی خدمت سے مطلب تھا، چاہے وہ جرمنی کے ہوں یا ہندوستان کے۔ آپا جان کے ایسے بے غرض اور پر خلوص کام بچوں کو بھی محبت، خلوص اور خدمت پر آمادہ کرتی ہے۔

محترمہ ذکیہ ظہیر نے خواجہ الطاف حسین حالی کے پر نواسے خواجہ غلام السیدین کی سوانح بچوں کے لئے لکھی ہے، جو ان کی خاندانی شرافت سخاوت، وضعداری، روشن خیالی، علم دوستی اور علم پروری کی روشن داستان ہے۔ غلام السیدین صاحب نے ہندو بیرون ہند اعلیٰ تعلیم حاصل کی، علیگڑھ تدریسی کالج کے طلباء کی بہترین تربیت کر کے ہزاروں کی تعداد میں اچھے استاد تیار کئے، وہ گاندھی جی کی ''بنیادی تعلیمی کمیٹی'' کے اہم رکن بنے، جس کی وجہ سے انھیں گاندھی جی سے بار بار ملنے اور ان کے خیالات کو سمجھنے اور اپنانے کا موقع ملا، گاندھی جی نے ان کی شخصیت پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔

اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد مختلف ریاستوں میں بنیادی تعلیم شروع کی گئی، چنانچہ کشمیر کے وزیر اعظم نے سیدین صاحب کو دعوت دی کہ وہ ریاست کی تعلیمی باگ ڈور سنبھالیں، انھوں نے ریاست کشمیر میں سات سال رہ کر بڑی جدوجہد، خلوص اور محنت سے کشمیر کے تعلیمی نظام کی جدید تشکیل کی، اس کتاب کے مطالعہ سے بچوں میں تعلیمی جدوجہد، خلوص، خدمت اور رواداری کا جذبہ پیدا ہوگا اور اپنے اسلاف کے روشن کارناموں سے واقفیت حاصل ہوگی۔

سابق چانسلر مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی حیدرآباد سیدہ سیدین حمید نے ''بچوں کے الطاف حسین حالی'' نامی کتاب میں بچوں کو افسانوی طرز میں حالی سے متعارف کرایا ہے، خاص طور پر حالی کے علمی و تعلیمی سفر کی روداد بڑے دل نشیں انداز میں بیان کی ہے۔

بچوں کے غیر افسانوی ادب میں ایک باوقار نام طیبہ بیگم کا ہے، جن کا تعلق حیدرآباد کے مشہور علم دوست بلگرامی خاندان سے ہے، انھوں نے بچوں کے لئے سائنسی اور سوانحی ادب پر کئی کتابیں لکھی ہیں، انھوں نے بچوں کے لئے نظام الملک آصف جاہ سابع میر عثمان علی خان کی سوانح لکھی ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے ان سے لکھوا کر اہتمام سے شائع کیا ہے، اس کتاب میں آخری نواب کا شاہی نسب نامہ، پرچم آصفی، ان کی شخصیت واخلاق، شاعری، نظم ونسق، تعلیمی اور علمی خدمات مختصر اور دلچسپ انداز میں جمع کئے گئے ہیں۔

محترمہ طیبہ بیگم نے بچوں کے لئے آسان اردو زبان میں سائنسی مضامین کا مجموعہ ''ہماری کائنات'' کے نام سے ترتیب دیا ہے، ''جوہی کی ڈالی'' کے علاوہ ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ''باجی کی دنیا'' بھی ہے۔(مذکورہ تینوں کتابیں انجمن ترقی اردو، اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد سے شائع ہوئی ہیں) جس میں دو کہانیاں: آسمان پر کتنے تارے ہیں؟ اور

چندا ماموں دور کے سائنسی کہانیاں ہیں، اور کہانی کے پیرائے میں بچوں کو سائنسی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

''ہماری کائنات'' میں محترمہ طیبہ بیگم نے آسان اور عام فہم زبان میں کائنات کی حقیقت، علم کائنات، نظام شمسی، سیاروں کی حرکت، قدرتی اور مصنوعی سیارے، دمدار ستارے، کہکشائیں، شہاب ثاقب اور خلائی اسٹیشن وغیرہ کے بارے میں مفید معلومات سے روشناس کرایا ہے۔ وجود کائنات کے سلسلے میں وہ لکھتی ہیں:

''وجود کائنات کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا کا حکم ہوا ''کن'' یعنی ہو جا، اور سب چیزیں ''فیکون'' یعنی وجود میں آ گئیں، چنانچہ ابھی تک فضاء میں نئے نئے ستارے اور سیارے اور دوسرے اجرام فلکی تشکیل پاتے ہی جا رہے ہیں اسی لئے مشہور شاعر علامہ اقبال نے کہا ہے:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

یعنی ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری کائنات ابھی مکمل نہیں ہے کہ ہر لمحہ خدا ''کن'' کہتا ہے اور نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔'' (صفحہ: 1)

اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصنفہ نے سائنسی مضامین میں ادبی چاشنی کے ساتھ خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے، اور سائنس کے حیرت انگیز انکشافات کو خدا کی عظیم قدرت کا کرشمہ قرار دیا ہے۔

اسی طرح محترمہ رفیعہ منظور الامین اپنے معلوماتی مضامین کے لیے بچوں کے ادب میں لائق ذکر ہیں، ان کے معلوماتی مضامین اپنی افادیت کے سبب مختلف درسی کتب میں شامل کئے گئے ہیں، اس موضوع پر ان کی کتاب ''خبر رسانی کے طریقے'' اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔

اگر درسی کتب کو غیر افسانوی ادب میں شامل کیا جائے تو حیدر آباد کی دو اہم قلم کار خواتین کا ذکر کرنا ضروری ہوگا، جنھوں نے بچوں کی درسی کتب کی ترتیب و تدوین میں بھی حصہ لیا ہے، اور بچوں کے لئے معلوماتی مضامین بھی قلم بند کئے ہیں۔ میری مراد ڈاکٹر اودیش رانی اور ڈاکٹر عالیہ خان ہیں، ڈاکٹر عالیہ خان بیس سال کے طویل عرصہ سے ہفتہ وار گلدستہ ضمیمہ روزنامہ منصف حیدر آباد کی ادارت انجام دے رہی ہیں، وہ ہر ہفتہ ''بچوں سے باتیں'' کے زیر عنوان بچوں کو مفید معلومات اور نصیحت سے نوازتی ہیں۔

اسی طرح بچوں کے لیے معلوماتی اور افادی مضامین لکھنے والوں میں واجدہ تبسم، عطیہ پروین، جیلانی بانو اور شبانہ جیسی مشہور افسانہ نگار خواتین شامل ہیں۔ (حوالہ سابق)

بچوں کے ادب پر تنقیدی و تحقیقی کام کرنے والوں میں خواتین کا بھی اہم حصہ ہے، اس سلسلہ میں مشیر فاطمہ کا نام لائق احترام ہے، جنھوں نے سب سے پہلے ادب اطفال کے مختلف نظریاتی پہلوؤں سے اردو داں طبقہ کو روشناس کرایا اور بچوں کے ادب کے لئے تنقیدی معیار قائم کیا، ورنہ ان سے پہلے اردو کے ناقدین اور مبصرین نے بچوں کے ادب کو ہمیشہ نظر انداز کیا تھا، مشیر فاطمہ نے اپنی کتاب: ''بچوں کے ادب کی خصوصیات'' (ناشر: انجمن ترقی اردو علیگڑھ 1962) میں بچوں کے ادب کی معیاری تعریف، بچوں کے ادب کی ضروریات و مسائل، ادب اطفال کی بنیادی خصوصیات اور بچوں کے ادب پر تنقید کے اصول سے واقف کرایا۔

مشیر فاطمہ کی طرح زیب النساء بیگم کا نام بھی بچوں کے ادب میں ناقد کی حیثیت سے شامل ہے، ان کی کتاب: ''اقبال اور بچوں کا ادب'' اردو ادب اطفال کے تنقیدی ادب میں قابل توجہ ہے، انھوں نے اقبال کی نظموں پر عملی تنقید کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کے نظریاتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور بچوں کے ادب کی ضروریات، خصوصیات اور مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

بچوں کے ادب پر تحقیق کرنے والوں میں دو خواتین ہماری نظر میں اور ہیں: (1) ڈاکٹر سیدہ مشہدی جن کی کتاب: ''اردو میں بچوں کا ادب'' 1990 میں ایمن پبلیکیشنز رانچی سے شائع ہوئی ہے، انھوں نے اس کتاب میں بچوں کے ادب کے تمام گوشوں پر تحقیقی و تنقیدی انداز میں سیر حاصل بحث کی ہے، دوسری خاتون ڈاکٹر فوزیہ چودھری مرحومہ ہیں، جو بچوں کے دو ماہی رسالہ ''غبارہ'' بنگلور کی بانی مدیر تھیں، انھوں نے بھی بچوں کے ادب پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا جو اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔

بچوں کے غیر افسانوی ادب میں خواتین کے حصہ پر مشتمل یہ ایک مختصر جائزہ ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کے افسانوی ادب: کہانی، ناول اور ڈرامہ کے مقابلہ میں غیر افسانوی ادب پر بہت کم خواتین نے توجہ دی ہے، جس طرح بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت ماں کی اہم ذمہ داری ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں، اسی طرح علمی و تربیتی نقطہ نظر سے بچوں کے غیر افسانوی ادب کی کمی کو دور کرنا اور ادب اطفال کو غیر افسانوی ادب سے مالا مال کرنا قلم کار خواتین کا ادبی و اخلاقی فریضہ ہے۔

Dr. Syed Asrarul Haque
Asst. Prof. & Head of Department.
Dept. of Urdu
Siddipet District-502103 (Telangana)

کہکشاں یاسمین

صغرا مہدی اور پہچان

صغرا مہدی کے کئی ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

''پہچان'' ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے جو 1995 میں شائع ہوا تھا۔ صغرا مہدی کی ایک اہم خوبی، جو انھیں اس دور کے دوسرے فن کاروں سے ممیز کرتی ہے، یہ ہے کہ وہ اپنے اور قارئین کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں کرنا چاہتیں۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اس مجموعے میں کسی بھی نقاد کے تعریفی بیانات شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ شاید انھوں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ قارئین نقاد کی لفاظی میں گم ہو کر کہیں افسانے کی صحیح شناخت نہ کر سکیں۔

''پہچان'' پندرہ افسانوں پر مشتمل ہے جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

''چوتھا کھونٹ'' ایک ایسے نوجوان کا افسانہ ہے جو شادی کے بندھن سے نفرت کرتا ہے۔ وہ ''کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ'' کے اصول پر عمل پیرا ہے۔ اس کی زندگی میں مختلف عورتیں آتی ہیں۔ وہ عورتیں جو اسی کی طرح زندگی کو ہنگامی عیش و عشرت سے تعبیر کرتی ہیں۔ پھر اس کی زندگی میں مادھوی داخل ہوتی ہے۔ وہ تیس سال کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ مادھوی اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ وہ بھی دھیرے دھیرے مادھوی سے اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ اس سے شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے:

> ''چوتھے کھونٹ آ کر اسے لگ رہا ہے کہ راستہ بھٹکانے والی کشتیاں ہی نہیں ہوتیں۔ بھولی بھالی سادہ لوح عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ شریف، پاکباز، نیک دل، نیک سیرت دل و جان سے چاہنے والی۔ اپنی محبت میں سب کچھ کھو دینے والی''۔

(''چوتھا کھونٹ''،''پہچان'' ص:13)

اس افسانے کا موضوع اچھوتا تو نہیں ہے مگر پھر بھی مرد کی نفسیات سے متعلق یہ ایک اچھا افسانہ ہے۔

''غریب خانہ'' بدلتے ہوئے حالات کے تحت طبقاتی تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ''غریب خانہ'' کی مرکزی کردار ''چھوٹی بٹیا'' کے والدین شریف اور عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پاس شرافت اور عزت کے علاوہ وسیع القلبی بھی ہے اس لیے ''غریب خانہ'' کا دروازہ ہر ضرورت مند کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ ''غریب خانہ'' کے افراد آس پاس کے کوٹھی والوں سے ملنا جلنا معیوب سمجھتے ہیں کیوں کہ نئی کوٹھیوں والے دولت مند ضرور ہیں لیکن ''شرفاء'' نہیں ہیں۔ افسانہ نگار نے 'چھوٹی بٹیا' کو اس دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق انھیں کوٹھیوں میں سے ایک انجینئر لڑکے سے دوستی اور پھر شادی کرتے ہوئے دکھا کر دراصل نئی نسل کے لیے طبقاتی درجہ بندی کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔

''ملبہ'' میں افسانے کی اٹھان بہت اچھی ہے۔ یہ افسانہ موضوع کے اعتبار سے منفرد تو نہیں ہے تاہم آج کے دور میں عورتوں کے گھریلو مسائل کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔

ایک مرد بیوی کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے فخر محسوس کرتا ہے۔ وہ اسے مردانگی کا نام دیتا ہے لیکن وہی مرد اپنی بیوی کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس پر کسی دوسرے مرد کا سایہ بھی پڑے۔ یہ افسانہ اسی نکتے کو پیش کرتا ہے۔

یہ افسانہ کچھ سوالات کو جنم دیتا ہے جن کا جواب افسانہ نگار کے پاس بھی نہیں۔ کہانی کے اختتام پر وہ کہتی ہیں:

> ''مگر وہ کب تک اپنے کو بگاڑ بگاڑ کر بنائے۔ توڑ توڑ کر جوڑے، کبھی کسی کے لیے کبھی کسی کے لیے''۔

(''ملبہ''،''پہچان'' ص:۲۲-23)

''گلابوں والا باغ'' بھی طبقاتی کشمکش کا آئینہ دار ہے:

> ''میں تو ضرور گلابوں والے باغ میں جاؤں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ تم عوامی لیڈر تھے، عوام کے لیے جے عوام کے

لیے مرے، تم یہاں کیوں آ گئے، میں اس کو اپنے ساتھ یہاں
لاؤں گا، اپنے ساتھ اس کچی قبر میں سلاؤں گا... وہ کہتا رہا۔
چیختا رہا مگر فرشتے نے اسے قبر میں دھکیل دیا۔ قبر بند ہو گئی"۔

("گلابوں والا باغ" پہچان ص:29)

اس افسانے کا موضوع نیا تو نہیں ہے، مگر تکنیک کے اعتبار سے یہ صفرا مہدی کا بہت ہی کامیاب افسانہ ہے۔ قبرستان کے پس منظر میں مُردوں کے درمیان اور مردے اور فرشتے میں جو گفتگو ہوتی ہے۔ وہ بے حد ڈرامائی اور سسپنس سے بھرپور ہے۔

افسانہ "نیلم شہزادی" میں بھی عورت کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عورت اور مرد کے درمیانی تعلقات نیز شوہر کی نفسیات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کہانی کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس کے پلاٹ کی تعمیر میں داستان گوئی سے مدد لی گئی ہے اور اسی مناسبت سے اس کا عنوان "نیلم شہزادی" رکھا گیا ہے۔

اس افسانے میں فرخ کی نفسیات کا تجزیہ بہ حیثیت شوہر کے بے حد کامیاب ہے۔ عظمیٰ کا کردار بھی بیوی کی حیثیت سے صحیح ہے۔ دونوں کے درمیان کشمکش اور تصادم کو بہت ہی سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ عظمیٰ شروع سے آخر تک جس سمجھداری، صبر، حوصلے، اپنائیت، محبت اور قربانی کا ثبوت دیتی ہے وہ افسانے کے کلائمکس پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ عظمیٰ ہار کر بھی بازی جیت جاتی ہے اور فرخ اپنے غرور اور اپنی انا کو قائم رکھنے کے باوجود یہ محسوس کرتا ہے کہ:

"وہ اکیلا ہوتا جا رہا ہے۔ تنہا بالکل تنہا۔ ایک گہرا سناٹا اس
کے وجود پر چھاتا جا رہا ہے"۔

("نیلم شہزادی" پہچان ص:33)

"پہچان" جڑواں بہنوں تمو اور بتو کی کہانی ہے۔ اس میں شناخت کے مسئلے کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس افسانے میں تمو عام انسانی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے، لیکن بتو کے ساتھ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ وہ بے حد حساس ہے اور خود کو ہر اعتبار سے تمو سے منفرد رکھنا چاہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر کام تمو کے برعکس کرتی ہے اور ہر وہ چیز پسند کرتی ہے جو تمو کو ناپسند ہو۔ اس طرح بتو نے اپنی الگ "پہچان" بنالی ہے لیکن راحت کی فرمائش پر کہ بتو لڑکیوں کی طرح کپڑے پہن کر میک اپ کرے، بتو الجھ جاتی ہے۔ اس کے سامنے اپنی شناخت کا مسئلہ بے حد پیچیدگی اختیار کر لیتا ہے۔ وہ نفسیاتی طور پر بیمار ہو جاتی ہے اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے۔

"بھروسہ" اور "دیوالی" افسانے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ فساد کے موضوع پر تحریر کیے گئے ہیں۔

"بھروسہ" میں ہندو اور مسلم خاندان کے درمیان رابطے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "دیوالی" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ دیہات کی فضا ہندو مسلم یکجہتی اور بھائی چارے کی فضا ہے۔ اس کے برعکس شہروں میں ترقی کے نام پر جلسے، جلوس اور ہنگامے ہوتے ہیں اور مذہب کے نام پر قتل و غارتگری ہے۔ صفرا مہدی نے اس سچائی کی اس طرح تصویر کشی کی ہے:

"آنکھ کھلی تو بس میں ہنگامہ تھا۔ ایک آدمی نے اسے اُتارا۔
اس کے منہ پر ٹارچ ڈالی۔ "تم کون ہو؟"۔ "ہم مجید ہیں
گاؤں جا رہے ہیں، دیوالی منانے"، سالا جھوٹ بولتا
ہے"... کئی لوگ مارے گئے... اس میں ایک چودہ سال کے
بچے (مجید) کی لاش بھی تھی جس کے پاس پڑے تھیلے سے دو
تین رنگین موم بتیاں جھانک رہی تھیں"۔

("دیوالی" پہچان ص:47)

"سمجھوتہ" میں GENERATION GAP کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر طنز کیا گیا ہے۔

اس افسانے میں ایک مذہبی گھرانے کے والدین اپنی اولاد کو مغربی تہذیب کی پیروی کرتے ہوئے دیکھ کر بھی خاموش رہتے ہیں۔ بیٹا بیٹی دونوں ہی ایک مغربی ملک میں رہائش اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی اولاد مشرق و مغرب کے تمدن کا ملا جلا مرقع نظر آتی ہے۔

بوڑھے والدین اپنی اولاد کی خوشی کی خاطر سب کچھ برداشت کر جاتے ہیں لیکن پوتی کلثوم کی شادی میں جب ایک غیر ملکی مرد رقص کرنے کے لیے دادی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے تو کلثوم کے دادا اور دادی کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے اور وہ واپس ہندوستان آ جاتے ہیں۔

"فیصلہ" ایک فلسفیانہ نکتے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس افسانے میں صفرا مہدی نسوانی کردار انو راد ھا پٹیل کے توسط سے یہ درس دیتی ہیں کہ انسان کو اپنی زندگی کا کوئی بڑا مقصد مدنظر رکھنا چاہیے:

"انو نے اپنی زندگی کا مقصد متعین کر لیا اور وہ بڑا تھا" ظلم نا
انصافی اور تعصب کے خلاف لڑائی... میرا خاص میدان
جرم ہے"۔ سب کے ہاتھوں میں پوسٹر تھے۔ چہرے پر
طمانیت کے ساتھ عزم تھا، اعتماد تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو
اپنی شناخت کے باوجود ایک لگ رہے تھے۔ ان میں سب
سے آگے انو تھی"۔

("فیصلہ" پہچان ص:57-56)

جہانِ نسواں

''نام'' ایک جذباتی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک مرد یعنی زبیر احمد کی انسانیت اور قربانی کے جذبے کو الفاظ کے پیرایے میں ڈھالا گیا ہے۔ زبیر احمد نے ایک بے سہارا ان بیاہی عورت کے بچے کو اپنا نام دے کر اپنی زندگی کی خوشیوں کو داؤ پر لگا دیا۔ وہ دس سال تک اپنی محبوبہ منگیتر سے جدا رہ کر درد و کرب سہتا رہا۔

''دوہری پرچھائیاں'' ایک ایسے انسان کا المیہ ہے، جس کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ایک طرف وہ ڈاکٹر سید عدنان الحسن ترمذی، ادیب، افسر، شوہر اور باپ ہیں اور دوسری طرف ایک نوجوان خوبصورت رقاصہ سونیا کے محبوب مصور ہیں۔ اس افسانے میں عدنان کے کردار کو بچپن ہی سے نفسیاتی کشمکش میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنے والدین بھائی، بہن، بیوی، رشتہ دار دوست سبھی کی محبت اور ہمدردی کو غلط معنی دیتا ہے اور اسے سبھی رشتوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ سکون کی تلاش میں سونیا کے قریب آ جاتا ہے مگر پھر بھی اسے مکمل سکون نہیں ملتا اور اس کی ذہنی کشمکش اس قدر بڑھتی ہے کہ وہ ذہنی اعتبار سے ماؤف ہو جاتا ہے۔ صغرا مہدی اس کردار کے خیالات کو ان الفاظ میں ظاہر کرتی ہیں:

''کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ تیسری دنیا کہاں سے آ گئی... نہ بول سکتا ہوں نہ سوچ سکتا ہوں، میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں، تو کیا میں مر گیا ہوں... تو کیا میں زندہ ہوں؟''۔

(''دوہری پرچھائیاں'' ص:72)

''دکھ کے دن اب بیتت نا ہیں'' بھی نفسیاتی مسئلے پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں جدیدیت کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ خوف، بے اطمینانی اور غیر محفوظ ہونے کا احساس یہ سب جدیدیت کے جزو لاینفک ہیں۔ اس افسانے میں جس گھر کی کہانی ہے وہ آج کل ہر گھر کی کہانی بنتی جا رہی ہے۔ بڑے شہروں میں زندگی بے حد مصروف ہے۔ گھر میں کوئی بھی فرد بیکار نہیں بیٹھتا۔ سب کچھ نہ کچھ کرنے اور بننے کی دھن میں رہتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی ضعیف گھر میں رہے تو اس کے لیے تنہائی اور اکیلا پن یقیناً سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ تنہائی انسان کے لیے بہت بڑی سزا ہے۔ تنہا انسان طرح طرح کے وہم و خیال کا شکار ہو جاتا ہے۔ اماں جی ایک ایسا ہی کردار ہیں۔ سوچتے سوچتے اماں جی کے ذہن میں اولاد ان کے خیالی پیکروں کی جگہ لے لیتی ہے:

''ہائے میں لٹ گئی، برباد ہوگئی، سب ختم ہوگئے۔ میں اکیلی رہ گئی۔ اور وہ سب مل کر اماں جی کو یہ یقین دلانے سے قاصر رہے کہ وہ اکیلی نہیں ہیں''۔

(''دکھ کے دن اب بیتت نا ہیں'' پہچان ص:78)

صغرا مہدی نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں عورتوں کے مسائل سے بحث کی ہے مگر عورتوں کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے وہ غیر جانبداری سے کام لیتی ہیں۔ جہاں عورتوں کی خوبیوں کو سراہتی ہیں وہاں ان کی کمزوریوں پر نکتہ چینی بھی کرتی ہیں۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہیں کہ سبھی عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ ایک طرف ان کے افسانے ''فیصلہ'' کی انورادھا پٹیل پچیس برسوں تک راہل کا انتظار کرتی ہے اور اس کی وفادار رہتی ہے، ''نام'' میں ڈاکٹر زہرہ حسن اپنے محبوب منگیتر کا انتظار دس برسوں تک کرتی ہے وہیں اس مجموعے کا آخری افسانہ ''میرے دل میرے مسافر'' کی نیا بوس نسوانی کردار کی پستی کا نمونہ ہے۔ ایسی عورت جو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی نہیں بن سکتی وہ صرف عیش و عشرت کی متلاشی ہے مگر کیا ایسی عورت کو سکون حاصل ہو سکتا ہے؟ غالباً نہیں۔ اسی لیے تو نیا بوس ہر سکھ حاصل کر لینے کے بعد بھی تشنہ ہی رہتی ہے۔

ان افسانوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے ان افسانوں میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ''پہچان'' میں شناخت کا مسئلہ زیر بحث ہے۔ ''غریب خانہ اور'' گلابوں والا باغ'' طبقاتی احساسات کے عکاس ہیں۔ ''ملبہ'' اور ''نیلم شہزادی'' میں عورت کی سرشت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''بھروسہ'' اور ''دیوالی'' جیسے افسانے فنکار کی وسیع النظری اور غیر متعصبانہ رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ صغرا مہدی نے کرداروں کی نفسیاتی تحلیل بھی کی ہے۔ ایسے افسانوں میں ''چوتھا کھونٹ''، ''دوہری پرچھائیاں''، ''دکھ کے دن اب بیتت نا ہیں''، ''میرے دل میرے مسافر'' شامل ہیں۔

تکنیک کے اعتبار سے کچھ افسانے بہ طور خاص لائق ستائش ہیں جیسے ''گلابوں والا باغ'' اور ''نیلم شہزادی''۔

صغرا مہدی اپنے افسانوں میں سادگی کو اہمیت دیتی ہیں۔ سیدھے سادے عام الفاظ استعمال کرتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے افسانے حقیقت پسندی کا مرقع نظر آتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں صغرا مہدی کی ''پہچان'' ایک کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے مسلم ہے۔

●●●

Kahkashan Yasmeen
G-5, Basera Apartment
Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar-110025

درخشاں تاجور

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں خواتین کا کردار

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اسرار الحق مجاز نے یہ شعر ہندوستانی عورت کو مخاطب کر کے 1937 میں اس وقت کہا تھا جب ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا قافلہ اپنی منزل کی طرف تیز رفتاری سے گامزن تھا اور ہندوستان کی خواتین اس قافلے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ شریک تھیں۔ لیکن جب ہم اس سے بہت قبل کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں جب یہ جدوجہد اپنے ابتدائی مراحل میں تھی تو یہ دیکھ کر ہمیں نہایت فخر کا احساس ہوتا ہے کہ اس وقت بھی خواتین جنگ آزادی میں مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر نہ صرف انگریزوں کو داد شجاعت دے رہی تھیں بلکہ قیادت کی ذمہ داریاں بھی بخوبی انجام دے رہی تھیں۔ اگر یہ کہیں تو بجا نہ ہوگا کہ 1857 میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جو طوفان اٹھا اسے ہوا دینے میں خواتین کی حصہ داری بھی کچھ کم نہیں تھی۔ یوں تو ایک لمبے عرصے سے انگریزوں کے ظلم و زیادتی کے خلاف نفرت ہندوستانیوں کے دلوں میں پنپ رہی تھی اور بقول سرسید احمد خاں اسے پھوٹنے کے لئے شتابے کی دیر تھی اور یہ شتابا وہ کارتوس بنے جنہیں استعمال کرنے سے پہلے منہ سے کاٹنا پڑتا تھا اور جن کے بارے میں سپاہیوں کو یہ خبر ملی کہ یہ کارتوس گائے اور سور کی چربی سے بنائے گئے ہیں چونکہ ہندوؤں کے لئے گائے قابل تعظیم ہوتی ہے اور مسلمانوں کے لئے سور کو حرام قرار دیا گیا ہے اس لئے سپاہیوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ ان کارتوسوں کو منہ سے نہیں کاٹیں گے۔ انگریزوں کے خلاف نفرت کی سرنگ کا پہلا بڑا دھماکہ میرٹھ کی چھاؤنی میں ہوا۔ 24 اپریل کی پریڈ میں 90 میں سے صرف 5 نے اپنے افسروں کا حکم مانا۔ حکم عدولی کرنے والے 85 سپاہیوں کے کورٹ مارشل کا حکم ہوا۔ 9/ مئی 1857 کو پریڈ میں ان لوگوں کو سزا سنائی گئی۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اس عہد کے ایک وقائع نگار معین الدین حسن خاں نے اپنی تصنیف ”خدنگ غدر“ میں لکھا ہے کہ:

”جب نویں تاریخ مئی 1857 کو کورٹ ختم ہوا اور تمام سپاہ گورہ اور ہندوستانی کی پریڈ جما کر مجرمان کو جو 85 نفر تھے واسطے سنانے حکم سزا کے پریڈ پر حاضر لائے اور ان کو...... حکم ہوا کہ ہتھیار رد دو ہم لوگوں نے ہتھیار ڈال دیے.... پھر حکم ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو...... پھر حکم ہوا کہ تم لوگوں کو عدول حکمی کی سزا دی جاتی ہے تم جیل خانے جاؤ ہم سلام کر کے جیل خانے کو چلے گئے...... جب ہم داخل جیل خانہ ہوئے تو کیمپ میرٹھ میں تہلکہ عظیم برپا ہو گیا...... گھر گھر کھچڑی پکنے لگی اور باہم صلاح و مشورہ ہونے لگے۔ خصوصاً فرقہ مستورات...... نے زبان طعن و تشنیع سے پنکھا جھل جھل کر نائرہ فتنہ و فساد کا بھڑکانا شروع کیا اور ان کی چرب زبانی آتش فساد پر روغن کا کام کر گئی کلمات فتنہ انگیز نے اور اشتعال طبع پیدا کیا اور تمام فوج کے دلوں میں جوش و خروش مردی اور مردانگی کی آگ بھڑک اٹھی اور وقت شب افواج پیادہ و سوار متفق کمر بندی ہوگئی اور جیل خانہ پر چڑھ گئے اور جیل خانہ توڑ کر چوراسی افسر جو قید تھے ان کو قید سے نکال لائے ان کی ہتھکڑیاں بیڑیاں سب کاٹ ڈالیں...... اب تمام شہر میں غدر مچ گیا اور ہنگام جدال و قتال گرم ہوا سرکار کی جانب سے گوروں کی کمر بندی ہوئی اور سو بجروں

کا توپ خانہ لاکر لگا دیا گیا اب دھائیں دھائیں توپ فائر ہونے لگی اور ہماری طرف سے جواب میں بندوقوں کی بار جھڑنے لگی تمام شب گوروں کی ہماری جنگ ہوتی رہی کہ ہم لوگ دہلی کو روانہ ہوئے شبانہ روز میں تیس کوس کی مسافت طے کرکے آج اس وقت ہم یہاں پہونچے ہیں۔ بادشاہ سلامت ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں اور ہمارا انصاف فرمادیں۔"

انقلابیوں نے بہادر شاہ کی شخصیت کی مرکزی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنا رہنما مان لیا۔ بغاوت کی آگ بہت تیزی سے ملک کے دوسرے علاقوں میں پھیل گئی یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پوری جنگ آزادی میں خواتین نے سرگرم شرکت کرکے انگریزوں کے ناکوں چنے چبوادیے۔ جن خواتین نے اس جنگ آزادی میں قیادت کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے انجام دیں ان میں بیگم حضرت محل اور رانی لکشمی بائی کا نام سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

حضرت محل نے اودھ میں اپنے بیٹے برجیس قدر کو عنان حکومت سونپ کر اس کے پردے میں خود امور سلطنت انجام دیے انھوں نے اپنی باہمت رعایا کی قیادت کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں اور انقلابیوں کو جرأت اور ہمت کے ساتھ انگریزوں سے سینہ سپر ہوجانے کا حوصلہ بھی دیا۔ ان کی

جواں مردی سے متاثر ہوکر ٹائمس کے نامہ نگار رسل نے انھیں جری اور باعزت مرد کے خطاب سے نوازا۔ بیگم حضرت محل نے انگریزوں کے سامنے کبھی گھٹنے نہیں ٹیکے۔ انھوں نے متعدد بار انگریزوں کے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا کہ اگر وہ مفاہمت کرلیں تو ان کے مرتبے کو قائم رکھا جائے گا اور ان کے شوہر کے بھتے کے علاوہ ان کی الگ سے پنشن بھی مقرر کردی جائے گی لیکن اس بہادر عورت نے انگریزوں کے ہر پیش کش کو ٹھکرا کر ان سے مقابلہ کیا۔ پسپا ہونے کے بعد انھوں نے نیپال میں پناہ لی، جہاں غریب الوطنی کا کرب جھیلتے ہوئے نہایت کس مپری کے حالت میں موت کو گلے لگا لیا۔ 1857 کے دوران نہایت دلیری کے ساتھ رہنمائی کی فرائض رانی لکشمی بائی نے بھی انجام دیے۔ انھوں نے جس بہادری سے انگریزوں سے لوہا لیا اس نے انگریزوں کو بھی انگشت بدنداں کردیا۔ انقلابیوں نے جب ان سے قیادت کی کمان سنبھالنے کی گذارش کی تو انھوں نے اپنا قیمتی ہیروں کا ہار دے کر انھیں دہلی روانہ کیا اور اپنے بیٹے کے نام سے جھانسی کا انتظام سنبھالا۔ جھانسی میں ہر مذہب وملت کے لوگوں نے انھیں اپنا رہنما تسلیم کیا اور انگریزوں کو ناکوں چنے چبوادیے۔ رانی لکشمی بائی نے بھی بیگم حضرت محل کی طرح آخر وقت تک ہار نہیں مانی انھوں نے میدان جنگ میں انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

بیگم حضرت محل اور لکشمی بائی تو وہ باہمت خواتین تھیں جنھوں نے 1857 میں قیادت کی کمان سنبھالی تھی لیکن ان کے علاوہ بھی بہت سی ایسی خواتین تھیں جن کے نام ہمیں تاریخ کی کتابوں میں جا بجا سنہرے حروف میں نمایاں نظر آتے ہیں اور جن کی قربانیاں بھی کم نہیں تھیں۔ خود رانی لکشمی بائی کی فوج میں مردوں کے ساتھ ہر مورچے پر عورتیں تھیں یہ عورتیں بارود، گولے اور توپیں چلانے میں مردوں کی معاون و مددگار تھیں۔ کاشی بائی، موتی بائی، جوہی ان کی فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھیں۔ جس وقت رانی لکشمی بائی انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئیں اس وقت ان کے ساتھ ایک مسلم لڑکی نے بھی انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے وطن کی محبت میں جان کا نذرانہ پیش کرکے شہیدانِ وطن کی صف میں اپنے نام کو بھی زندہ جاوید کرلیا۔ ملک کے ہر علاقے میں ایسی عورتوں کے نام مل جائیں گے۔ جو انگریزوں کے ظلم وستم کا شکار ہوئیں ایسی خواتین میں مظفر

نگر کی اصغری بیگم، حبیبہ اور رحیمی بھی تھیں جو وطن کی آن اور بان اور شان کے تحفظ کے لئے نثار ہوگئی تھیں لیکن آج ان کے نام سے بھی نئی نسل واقف نہیں ہے۔ اصغری بیگم کو انگریزوں نے زندہ جلادیا تھا تھا تو حبیبہ اور رحیمی کو انگریزوں نے پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

ایک اور بہادر خاتون جن کے ذکر کے بغیر ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی تاریخ مکمل ہو ہی نہیں ہوسکتی کانپور کی عزیزن تھی جو غاصب اور جابر حکمرانوں کے خلاف بہت بہادری سے برسرپیکار ہوئی تھی۔ عزیزن ایک معروف مغنیہ اور رقاصہ تھی۔ وہ نانا صاحب کی فوج میں شامل ایک بہادر عورت تھی جس سے انگریز حد درجہ خائف تھے۔ عزیزن نے اپنی باغیانہ کارروائیوں سے انگریزوں کو سخت ہراساں کر رکھا تھا۔ اس نے نانا صاحب کی رہنمائی میں انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ اسی وجہ سے جب کرنل

ولیم نے کانپور میں باغیوں کی فہرست مرتب کی تو اس میں عزیزن کا نام سب سے اوپر رکھا۔ عزیزن جب گرفتار کر کے ہیولاک کے سامنے لائی گئی تو انگریزوں نے اس کے سامنے تجویز رکھی کہ اگر وہ اپنا جرم قبول کرلے تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔ عزیزن نے انگریزوں کی اس تجویز کو ٹھکرادیا اور یہ پوچھے جانے پر کہ وہ کیا چاہتی ہے اس نے نڈر ہو کر جواب دیا کہ برٹش سامراج کا خاتمہ اور آزاد ہندوستان۔ اس بیباکی کا اسے وہی جواب ملا جو سفاک انگریز دے سکتے تھے۔ ہیولاک کے حکم سے اس پر گولیوں کی بوچھار کر دی گئی تابڑ توڑ گولیوں نے اس کے سینہ کو چھلنی کر دیا اور وہ نانا صاحب زندہ باد کا نعرہ لگا کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی۔ لیکن کچھ ایسی بدنصیب خواتین بھی تھیں جن کی قربانیوں کا ذکر اس عہد کے چشم دید وقائع نگاروں نے تو کیا ہے لیکن تاریخ نے ان کے نام کو محفوظ نہیں کیا ایسی ہی ایک بہادر بڑھیا کا ذکر ہڈسن نے اپنی کتاب۔ "Twelve Years in India" ظہیر دہلوی نے "داستان غدر" خواجہ حسن نظامی نے "بیگمات کے آنسو" اور غدر دہلی کے افسانے" میں کیا ہے، ظہیر دہلوی وطن کی عزت اور آبرو پر نثار ہونے والی اس بڑھیا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایسے ہی ایک بوڑھیا عورت تھی کہ وہ سر کو منڈا سا باندھ کر اور کمر میں دوپٹہ کس کر سب سے آگے ہو جاتی تھی اور لوگوں کو ترغیب دلاتی تھی چلو بیٹا جہاد پر چلو نہ معلوم وہ کتنی کون تھی روز بازار میں کھڑے ہو کر لوگوں کو لا کر جاتی تھی اور آپ سب سے آگے ہوتی تھی اور پھر وہ بچ کر زندہ سلامت آجاتی تھی اور صدہا آدمی کا خون کراتی تھی اور پھر جب شہر میں فوج داخل ہوئی ہے تو اس کا پتہ نہ پایا۔"

اسی عورت کا ذکر خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب "بیگمات کے آنسو" اور "غدر دہلی کے افسانے" میں سبز پوش عورت کی لڑائی" کے عنوان کے تحت کیا ہے۔ ملک وقوم کی اس بے نام مجاہدہ کا ذکر جیون لال نے بھی اپنے روزنامچے میں کیا۔ اس نے 20/جولائی 1857 کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

اس تاریخ ایک عورت نے بڑی بہادری دکھائی اور جب فوج لوٹ آئی تو یہ عورت تن تنہا 40 گوروں سے لڑتی رہی اور اس نے ایک گورے کو مار ڈالا۔

خواجہ حسن نظامی نے "محاصرہ دہلی کے خطوط" میں لفٹنٹ ڈبلیو ایس آر ہڈسن کے ایک مراسلے کا ترجمہ شائع کیا ہے جسے ہڈسن نے جے ڈگلس فارسیتھ ڈپٹی کمشنر انبالہ کے نام 29/جولائی 1857 کو ارسال کیا تھا۔ اس خط میں اس بوڑھی عورت کی گرفتاری کی خبر ہے۔ خط ملاحظہ ہو جس میں اس عورت کی بہادری و دلیری اور بے خوفی کے جذبے کی غمازی ہوئی ہے۔

"دہلی کیمپ 29 جولائی

مائی ڈیر فارسیتھ"

"جو بوڑھی خاتون بہ نفس نفیس اسی مراسلہ کے ہمراہ آرہی ہے۔ وہ محاصرہ دہلی کی مکمل ومجسم داستان ہے وہ ہمارے خلاف شہر میں جہاد کا وعظ کہتی تھی اور اس نے اپنے مواعظ ونصائح سے تعجب خیز طریقہ پہ مسلمانوں کے دلوں میں جوش پیدا کر دیا تھا۔ بالآخر اس کی عدم کامیابی سے متنفر ہو کر وہ خود میدان جنگ میں اتر آئی اور سبز لباس پہن کر گھوڑے پر سوار اور تلوار و بندوق سے مسلح ہو کر اس نے سواروں کے ایک دستہ

کی کمان ٹی اور 75 ویں پیدل فوج پر حملہ آور ہوئی۔ سپاہیوں کا بیان ہے کہ اس ایک کا مقابلہ کرنا پانچ سپاہیوں کے مقابلہ سے زیادہ مہلک تھا اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ان کے رفقاء میں سے بہت سوں کو نشانہ بندوق بنا دیا۔ آخرکار وہ زخمی ہو کر گرفتار ہو گئی۔ جنرل نے اول اول اسے آزادانہ طور پر چلے جانے کی اجازت دینی چاہی تھی مگر میں نے اس سے یہ منت درخواست کی کہ وہ ایسا نہ کریں، اسلئے کہ وہ پھر شہر میں فاتحانہ طریقہ سے داخل ہوگی اور ہمارے قبضہ سے نکل جانے پر تعصب کا طوفان بے تمیزی مچادے گی اور بلا شبہ یہ ظاہر کرے گی کہ وہ اپنی کرامت کی وجہ سے بچ گئی ہے۔ اور اسی طرح جون آف آرک کا سا رتبہ حاصل کرے گی۔

مجھے اس کو آپ کے پاس بھیجنے کی اجازت مل گئی ہے تاکہ وہ جیل خانہ میں بحفاظت تمام رکھی جائے یا جہاں کہیں آپ مناسب خیال کریں۔ تاوقتیکہ یہاں کا کام ختم نہ ہو جائے۔

کیا آپ برائے مہربانی اس امر کی نگہداشت رکھیں گے کہ اس کا طرز عمل قابل اطمینان رہے۔ یہ کہتے ہوئے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت اس بڑھیا کھوسٹ نے معقول اثر پیدا کر لیا تھا۔

آپ کا زیادہ مخلص

ڈبلیو آر ہڈسن"

ظہیر دہلوی نے جس بڑھیا عورت کا ذکر اپنے روزنامچے میں کیا اس کا تعلق تو دہلی سے تھا لیکن ملک کے مختلف علاقوں میں ایسی گم نام عورتیں لاتعداد تھیں جو انگریزوں سے بڑی بہادری سے مصروف جنگ رہیں۔ کانپور، جھانسی اور لکھنؤ میں بھی عورتوں نے انگریزوں سے زبردست مورچہ لیا۔ گورڈن الکزنڈر نے لکھنؤ میں سکندر باغ کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے

لکھا کہ یہاں عورتیں جنگلی بلیوں کی طرح دیوانہ وار جنگ کر رہی تھیں فوربس مچل نے سکندر باغ کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد جب کچھ سپاہی پانی لینے کے لئے ایک درخت کے نیچے پہونچے جہاں پانی کا ایک گھڑا رکھا تھا تو ایک نامعلوم جگہ سے گولیاں چلیں جس سے دشمن کی فوج کے چھ سپاہی وہیں ڈھیر ہو گئے۔ کیپٹن کے حکم سے ایک افسر نے وہاں جب گولی باری کی تو پیڑ سے ایک جوان عورت کی لاش گری جو پرانی قسم کی ایک کیولری پستول سے لیس تھی ایک بھرا ہوا پستول اس کے پٹی میں لگا ہوا تھا اس کی تھیلی میں بارود بھرا ہوا تھا۔ اس عورت نے یہ بہادری اس وقت دکھائی جب جنگ ختم ہو چکی تھی اور میدان جنگ میں لاشوں کا فرش بچھ چکا تھا۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں ان خواتین کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ناخواندہ تھیں اور جنھوں نے اس میں شرکت بھی نہیں کی تھی لیکن انھوں نے اپنے اپنے انداز سے انقلابیوں کے جوش و جذبے کو توانائی بخشی تھی۔ ایسی ہی خواتین کی جھلک ایک چشم دید معین الدین حسن خاں نے اپنی کتاب "خدنگ غدر" میں پیش کی ہے جو اسی عہد میں لکھی گئی تھی اور جو کہ جنگ آزادی کی تاریخ پر مستند ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ معین الدین حسن خاں کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"جس قوم کا کوئی لڑائی سے بھاگتا تھا اس قوم کی عورتیں جو پانی پلانے کھڑی تھیں وہ گالی دے کر اس بھاگنے والے کو کہتی تھیں کہ ہمارا لہنگا اور اوڑھنا تو لے جا چوڑیاں پہن لے، تلوار اپنی ہم کو دے بھاگ کر کہاں جاتا ہے اس غیرت میں ہزاروں آدمی کٹ کے مر گئے۔"

غرضیکہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں خواتین کا کردار بہت ہی شاندار رہا ہے۔ تاریخ میں ان خواتین کی قربانیوں کو آب زر سے لکھا جانا چاہئے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے تاریخ کی ان بہادر بیٹیوں کی قربانیوں کو یکسر فراموش کر دیا گیا اگر وہ اس ناانصافی کے خلاف یہ شکوہ کریں تو حق بجانب ہوگا کہ۔

میرے لہو کی دھار سے وطن کی بیڑیاں کٹیں
مگر کتاب حریت میں میری داستان نہیں

Dr. Drakhshan Tajwar
Kainaat B-34
Tiwaripur Awas Vikas Colony
Gorkhpur-273001 (U.P)

حیدرآباد میں جنگِ آزادی

سیدہ جعفر

جب دلّی اور شمالی ہند کے دوسرے علاقوں میں حریت پسند، برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے، حیدرآباد میں چوتھے آصف جاہی حکمراں، ناصرالدولہ، انگریز ریذیڈنٹ کی خوشنودی حاصل کر کے اپنے سیاسی موقف کو مستحکم کرنے کی فکر میں منہمک تھے۔ 22/رمضان 1273ھ مطابق 1857 کو ناصرالدولہ نے رحلت کی "گلمپسس آف دی نظامس ڈومنین" (GLIMPSES OF THE NIZAM'S DOMINION) میں کلاڈ کیمپ بل لکھتا ہے کہ اپنی وفات سے قبل ناصرالدولہ نے دیوانِ سلطنت سالار جنگ کو طلب کیا اور اپنے فرزند افضل الدولہ سے آخری ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔
ناصرالدولہ نے بسترِ مرگ پر اپنے ولی عہد کو جو وصیت کی وہ یہ تھی:

"برٹش حکومت کا رویہ میرے ساتھ ہمیشہ دوستانہ رہا ہے، اس لیے میری وصیت ہے کہ تم بھی انگریز حکومت کے ساتھ وفادار رہنا اور اسی میں ہماری سیاسی بقا مضمر ہے"۔

جب ریذیڈنٹ ڈیوڈسن افضل الدولہ کی تقریب تخت نشینی میں شرکت کر کے ریذیڈنسی واپس ہوا تو اسے گورنر جنرل کا ٹیلیگرام وصول ہوا جس میں لکھا تھا "دہلی انگریزوں کے ہاتھ سے نکل رہی ہے اور یہاں غدر کا قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو گیا ہے"۔ ڈیوڈسن نے فوراً سالار جنگ کو طلب کر کے صورتِ حال سے واقف کروایا تو انھوں نے جواب دیا کہ شہر میں تین دن سے اس شورش کی خبریں گشت کر رہی ہیں لیکن حکومت آصفیہ کی وفاداری اور اس کا اعتماد ایک لمحے کے لیے بھی متزلزل نہیں ہوا ہے اور ہمیں یقین کامل ہے کہ بالآخر برطانوی فوجوں کی فتح ہو گی اور ان کی عسکری قوت کے سامنے باغیوں کو ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔

حیدرآباد کا باشعور طبقہ ریاست کی حکمتِ عملی سے برافروختہ تھا۔ عوام سیاسی اطاعت کی دوہری زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ نظام حیدرآباد سے وفاداری اور بدیسی حکمرانوں سے محبت دونوں لازم و ملزوم بن گئے تھے اور اس بوالعجبی نے حیدرآباد کے باشندوں کو ایک عجیب طرح کی ذہنی اور جذباتی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا:

تمھیں چاہوں تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں

کی مجبوری ان کے لیے سوہانِ روح بن گئی تھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ:

اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست
زنہار بارِ عشق اٹھایا نہ جائے گا

اس دور کے مشہور شاعر "استادِ کل" شمس الدین فیض نے غزل کی رمزیت و ایمائیت کے پردے میں اس صورتِ حال کا اس طرح اظہار کیا تھا:

اے دوست مجھ سے ہو نہ سکے گی کبھی یہ بات
وہ چاہیں دشمنوں کو میرے، ان کو چاہوں میں

شخصی حکومت میں اظہارِ خیال کی آزادی پر جو قدغن ہوتی ہے اس نے شعرائے حیدرآباد کے لبوں پر مہرِ سکوت ثبت کر دی تھی لیکن وہ اس حقیقت کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ محسوس کرنے لگے تھے کہ:

دامنِ یار تک آنے لگے اغیار کے ہاتھ
(فیض)

کڑے احتساب کے اس دور میں شہر آشوب یا نظم کے حقیقت پسندانہ اور براہِ راست اسلوب میں کوئی چونکا دینے والا شعری اکتساب اس دور میں ہمارے سامنے نہیں آتا۔ حیدرآباد میں صورتِ حال یہ تھی کہ افضل الدولہ نے اپنی فوج کو دولتِ انگلشیہ کی حفاظت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ "دی فری ڈم اسٹرگل ان حیدرآباد" (THE FREEDOM STRUGGLE IN HYDERABAD) کے مصنف کا بیان ہے کہ میرٹھ میں جب 10/مئی 1857 کو شورش نے زور پکڑا اور بہادر

شاہ ظفر کے شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کردیا گیا تو اس خبر نے حیدرآباد میں تہلکہ برپا کردیا۔ ریذیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن نے اپنی ایڈمنسٹریٹو رپورٹ متعلقہ 1857 تا 1859 میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ بقول ایچ جی برگس (H.G. BRIGGS) اس وقت حیدرآباد برطانوی سیاست کے نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت کا حامل بن گیا تھا اور ہندوستان میں بدیسی حکومت کے توازن کا بڑی حد تک جنوب کی اس اہم سلطنت ہی پر انحصار تھا ادھر حیدرآبادی عوام میں دن بدن بے چینی پھیل رہی تھی جس کا ایک سبب اورنگ آباد کے اُن غازیوں کی بے رحمانہ گرفتاری بھی تھا جنھوں نے حیدرآباد آکر پناہ لی تھی۔ کیپٹن ہسٹنگس فریزر (CAPT. HASTINGS FRASER) کا بیان ہے کہ شمالی ہند کے مختلف شورش زدہ علاقوں سے اس وقت وطن پرست جوق در جوق حیدرآباد کا رخ کررہے تھے۔ آزادی کے یہ متوالے اپنے انقلابی تصورات کے ساتھ حیدرآباد آئے تھے اور ان کی آمد نے بھی حیدرآباد کے سیاسی ماحول میں ہلچل پیدا کردی تھی۔ سالار جنگ نے عرب فوج کے دستوں کو شہر کے دروازوں پر متعین کردیا تھا اور یہ حکم دیا تھا کہ جو شخص حکومت برطانیہ کے خلاف عوام کو مشتعل کرنے کی کوشش کرے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے۔

سالار جنگ کی اس حکمت عملی کو میجر جنرل ہل (HILL) نے بہت سراہا تھا۔ وہ ہز ہائی نس کے چیف ملٹری کمانڈر تھے۔ برطانوی حکومت نے خوش ہوکر نظام کا سابقہ قرضہ معاف کردیا اور ان کے لیے دس ہزار پاؤنڈ کے قیمتی تحائف روانہ کیے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد بقول سید مہدی علی مصنف ''حیدرآباد افیرز'' (HYDERABAD AFFAIRS) نظام کو ''ستارۂ ہند'' کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔ اس کے علاوہ "MOST EXALTED" کا مرتبہ بھی عطا کیا گیا تھا۔ 1857 کی شورش کے دوران افضل الدولہ نے انگریزوں کی جو اعانت کی تھی اس کے صلے میں ''یار وفادار'' (FAITHFUL ALLY) کے خطاب سے بھی نوازا گیا تھا۔ کیپٹن ہسٹنگس فریزر نے اپنی کتاب ''آور فیتھفل الائی'' (OUR FAITHFUL ALLY) میں جو لندن سے 1865 میں شائع ہوئی تھی اس سے مفصل بحث کی ہے۔

حیدرآبادی عوام نے بقول سروجنی ریکانی ان عنایات و خطابات کو ''طوق برطانیہ'' سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ سنٹرل ریکارڈ آفس کی ADMINISTRATIBLE فائلوں سے پتہ چلتا ہے کہ شہر کی اکثر گزرگاہوں پر اس کے خلاف پوسٹر چسپاں کیے گئے تھے اور نظام کے ''ستارۂ ہند'' خطاب قبول کرنے پر غم و غصے کا اظہار کیا گیا تھا۔ حیدرآبادی عوام بے عملی اور بے حسی کا شکار نہیں تھے انھوں نے اپنی حریت پسندی، وطن دوستی اور انگریزی حکومت سے بیزاری اور نفرت کا عملی ثبوت دیا تھا۔ اس دور کے ایک حیدرآبادی شاعر بالا پرشاد ربطؔ کہتے ہیں:

سر سے کفن لپیٹے ہوئے پھر رہے ہیں ربطؔ
مرنے کے اشتیاق میں قاتل کے ساتھ ساتھ

ملک کی نامور محبِّ وطن شخصیتوں نانا صاحب، تانتیا ٹوپے، رانی جھانسی اور بیگم اودھ وغیرہ کے حالات سے حیدرآبادی عوام ناواقف نہیں تھے اور ان کے دلوں میں جذبہ آزادی کی شمع روشن تھی۔ شمس الدین فیضؔ حیدرآباد کے صاحب کشف و کرامات صوفی تھے وہ زندگی بھر "متاع الدنیا قلیلا" کے قائل رہے اور اس عالم بے ثبات کے اعتبارات کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا وہ ایک انسان دوست اور وطن پرست شاعر تھے اس لیے جب برطانوی استبداد، احترام آدمیت کے لیے ایک چیلنج بن گیا تو انھوں نے حیدرآبادی عوام کو یہ کہہ کر للکارا تھا:

ہے دشمن دکن وہ کلاہ پوش جس نے فیضؔ
غارت کیا ہے تختۂ ہندوستان کو

جنوبی ہند میں تندی ورک، بلاری، منگلور اور والا جاہ پیٹھ جیسے اہم فوجی مراکز میں سپاہیوں نے بغاوت کردی جس کے جواب میں انگریزوں نے ان کے ہتھیار ضبط کرکے انھیں برطرف کردیا حیدرآباد کے امراء راؤ رنبھا اور نورالامراء انگریزوں کی اس زیادتی سے بہت برہم ہوئے اور انھوں نے ان سپاہیوں کو اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا جس کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے حکومت برطانیہ کے دشمنوں کو پناہ دی تھی۔ چنانچہ ان امراء پر ریذیڈنٹ کا عتاب نازل ہوا اور گورنر جنرل نے نظام کو ایک مراسلہ روانہ کیا کہ ان دونوں امراء کو حیدرآباد کی سکونت ترک کرنے کا فوراً حکم دیا جائے۔ شہر بدر ہوکر ان دونوں نے اپنی جاگیروں میں پناہ لی۔

راجہ مہپت رام حکومتِ آصفیہ کے جلیل القدر امراء میں سے تھے اور ایک بڑی فوج کے کمانڈر تھے۔ مہپت رام آزادی وطن کے خواب دیکھ رہے تھے اور اس کے لیے منصوبہ بندی میں مصروف تھے جب انگریزوں کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے دیوان میر عالم کو ان کی سرکوبی کا حکم دیا اور جاگیریں ضبط کرکے حیدرآباد کی رہائش ترک کرنے پر مجبور کردیا۔ راجہ مہپت نے شاہ پور میں فوج جمع کی جب اس کی خبر انگریزوں تک پہنچی تو انھوں نے ایک فوجی دستہ مہپت رام کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ اس کا کمانڈر گارڈن اور افسر اعلیٰ ولیم پامر تھے۔ میجر گارڈن مہپت رام کے توپ خانے کی طرف پیش قدمی کررہا تھا لیکن جنگ میں مارا گیا۔ انگریزی فوج

بری طرح پسپا ہوگئی راجہ مہپت رام نے پارمر کو گرفتار کرلیا اور ہندوستانیوں سے غداری کے جرم میں اس کے جسم پر متعدد جگہ چرکے دیے۔ انگریز افسر خاموش نہیں رہے اور انھوں نے ایک بڑا رسالہ روانہ کردیا اور مہپت رام ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگیا۔ مہپت رام جنگِ آزادی کا وہ زندہ جاوید سورما ہے جس کے کارنامے اہل حیدرآباد کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوسکیں گے۔

جنگ آزادی کے ایک اور مجاہد مبارز الدولہ تھے۔ وہ تیسرے آصف جاہ یعنی سکندر جاہ کے فرزند اور چوتھے آصف جاہ ناصر الدولہ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ وہ وہابی تحریک سے وابستہ تھے۔ 1831 میں سید احمد کا انتقال ہوگیا۔ وہابیوں نے مبارز الدولہ کو ہندوستان میں اپنا قائد اور رہنما تسلیم کرلیا تھا۔ وہ برطانوی استحصال اور استبداد کے سخت ترین مخالف تھے۔ 1815 میں ملازمین کے ایک معمولی جھگڑے میں ریذیڈنٹ نے مبارز الدولہ کے محل کا محاصرہ کرلیا اور گولہ باری شروع کر دی۔ مبارز الدولہ کی فوج کے ایک حبشی سپاہی نے چشم زدن میں انگریزی توپ پر قبضہ کرلیا اور اس کا رخ انگریزی دستے کی طرف پلٹ دیا۔ مبارز الدولہ اور ان کے سپاہیوں کی جانبازی کے باوجود بالآخر انھیں شکست اٹھانی پڑی اور انگریزوں نے مبارز الدولہ کو بغاوت کی پاداش میں قلعہ گولکنڈہ میں قید کردیا۔ لیکن وہ موقعے کے منتظر رہے اور انگریزوں کے خلاف صف آرا رہے۔ تیسری بار مبارز الدولہ کو قطب شاہیوں کے موتی محل میں قید کیا گیا جہاں انھوں نے 15/ جون 1854 میں وفات پائی۔ برطانوی حکومت کے خلاف مبارز الدولہ کی جدوجہد تاریخ حیدرآباد کا ایک روشن باب ہے۔ اس عہد کا ایک حیدرآبادی شاعر کہتا ہے:

بعد دفع سرکشاں رہتا ہے کچھ باقی نشاں
خار نکلا پاؤں سے پر یاد ایذا رہ گئی

(فیض)

جہانگیر خاں کے ریذیڈنٹ پر قاتلانہ حملے سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فرنگی تسلط سے حیدرآبادی کتنے ناخوش اور بیزار تھے اور "فیتھفل الائی" (OUR FAITHFUL ALLY) میں کیپٹن فریزر نے اس واقعے کی تفصیل قلم بند کی ہے۔

جب میرٹھ کی فوجی بغاوت کی اطلاع حیدرآباد پہنچی تو ۱۰/ جون 1857 کو اورنگ آباد کی دیسی چھاؤنی نے علم بغاوت بلند کردیا۔ انگریزوں نے پونا اور احمد نگر سے فوج طلب کرلی اور گولیوں کی بوچھار سے دیسی سپاہیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ فوج کے کمانڈر امیر خان نے مجبور ہوکر دوسری سمت قدم بڑھائے۔ جن سپاہیوں کو گرفتار کیا گیا تھا انھیں توپ کے منہ پر باندھ کر سزائے موت دی گئی۔ ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی (HISTORY OF THE INDIAN MUTINY) میں چارلس بال (CHARLES BALL) نے اس کی تفصیل درج کی ہے۔

تاریخ حیدرآباد میں فوج کے ایک جانباز کا یہ جملہ ہمیشہ محفوظ رہے گا، اس نے سزائے موت کے وقت کہا تھا: "میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ گناہوں سے پاک ہورہا ہوں اور وطن پر جان فدا کرنے کا مجھے اعزاز ملا ہے، خدا میری اس قربانی کو قبول کرے"۔ یہاں بے ساختہ رام پرشاد بسمل کا یہ شعر یاد آتا ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

"HISTORICAL AND DESCRIPTIVE SKETCH OF H.E.H. NIZAM'S DOMINION" میں سید علی بلگرامی اور C.WILLMOTT لکھتے ہیں کہ امیر خان کو گرفتار کرکے انڈمان بھیج دیا گیا تھا۔ مکہ مسجد میں حریت پسندوں نے ایک جلسہ عام منعقد کیا جس میں بعض عمائدین ریاست اور شمس الامراء، فخر الدین خان کے فرزند رشید الدین خان، اقتدار الملک، عظمت جنگ، لشکر جنگ، محمد چاند، محمد یار خاں اور حکیم ابراہیم جیسی شخصیتیں شامل تھیں۔ چار مینار اور مکہ مسجد پر "جہاد" کے پوسٹرز چسپاں کیے گئے تھے اور ان میں انگریز حکومت سے نبرد آزمائی کو جہاد کے مترادف قرار دیا گیا تھا۔ انقلاب پرستوں نے مکہ مسجد پر اپنا پرچم بلند کرنا چاہا لیکن سالار جنگ اول کے عرب سپاہیوں نے انھیں پرچم کشائی سے باز رکھا۔ یہ کوئی معمولی اقدام نہیں تھا اس واقعے نے ریذیڈنٹ کے ہوش اڑا دیے۔ غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "1857" میں اخبار "پنجابی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسجدوں میں صاف صاف کہا جاتا تھا کہ نظام کو جو انگریزوں کے حامی ہیں حکومت سے بے دخل کرکے مغل خاندان کے کسی فرد کو حکمران بنادیا جائے"۔

25/ شوال 1273ھ مطابق 17/ جولائی 1857 کو مولوی علاء الدین اور لشکر جنگ نماز جمعہ کے بعد ریذیڈنسی پر حملے کے لیے سر سے کفن باندھ کر نکلے۔ مولوی علاء الدین کا نظریہ حیات یہ تھا کہ غازی کی طرح جینا اور شہید کی حیثیت سے مرجانا چاہیے وہ شمس الامراء کے دربار سے وابستہ تھے اور تمام ریاست میں ان کے معتقدین پھیلے ہوئے تھے۔ مولوی علاؤ الدین کی سرکردگی میں ریذیڈنسی پر حملہ کرنے والوں کا گروہ اس طرح آگے بڑھا کہ دراز ریش مولوی صاحب کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ تھی اور ان کے جوش و خروش کو دیکھ کر بیشمار عقیدت مند اور تلامذہ جلوس میں شامل ہوتے جارہے تھے۔ رفتہ رفتہ حریت پسندوں کے اس جلوس نے

ایک بے قابو مجمع کی صورت اختیار کرلی۔

طرہ باز خان حیدرآباد کے ایک متمول اور صاحب ثروت واقتدار پٹھان جمعدار تھے۔ان کے یہاں کئی بہادر پٹھان ملازم تھے۔وہ ریاست میں انگریزوں کی مداخلت بیجا اور ان کے ناجائز تصرف سے سخت متنفر تھے۔ جب مولوی علاءالدین کی قیادت میں ریذیڈنسی کی طرف پیش قدمی کرنے والا گروہ بیگمی باولی کے قریب پہنچا تو طرہ باز خان بھی اپنے سپاہیوں کے ساتھ شامل ہوگئے۔اس زمانے میں ریذیڈنسی کے اطراف کوئی فصیل نہیں تھی یہاں جنگل پھیلا ہوا تھا اور کھیت لہلہاتے تھے۔ جب ہزاروں سرفروشوں نے محلہ گولی گوڑہ پہنچ کر ریذیڈنسی پر حملے کی تیاری شروع کی تو ریذیڈنسی سے توپ کے گولے برسائے جانے لگے۔ مشتعل ہجوم نے ریذیڈنسی کا دروازہ توڑ ڈالا لیکن وہ عوام جن کے پاس صرف چھوٹی چھوٹی بندوقیں یا لاٹھیاں اور تلواریں تھیں توپ اور گولیوں کی تاب نہ لاسکے اور پسپا ہوگئے۔ ہزیمت کے بعد صبح تک مجمع منتشر ہوگیا۔مولوی علاءالدین نے جنگل میں پناہ لی اور طرہ باز خان اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر روپوش ہوگئے۔ریذیڈنٹ کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ نظام حیدرآباد کو سرکاری طور پر اس واردات کی اطلاع دے چنانچہ حکمران وقت افضل الدولہ کے ملاحظے میں یہ مراسلہ روانہ کیا تھا:

''بتاریخ ۱۸ ر جولائی 1857

کل چار بجے شام طرہ باز خاں جمعدار معہ سپاہیوں کے چھاؤنی ریذیڈنسی کے اندر پہنچ گیا اور اس کے ساتھیوں نے پھاٹک توڑ کر ریذیڈنسی کے اندر آنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے توپیں چلانے کا حکم دیا گیا اور مجمع منتشر ہوگیا اور ابن صاحب اور گوپال داس کے مکانوں میں شورش برپا کرنے والوں نے پناہ لی اور یہاں سے تمام رات ریذیڈنسی پر گولیاں برساتے رہے۔رات کا وقت تھا اس لیے ہم نے راست حملے سے اپنے سپاہیوں کو باز رکھا اور ان دونوں مکانوں پر عرب پہرے دار مقرر کردیے۔آج صبح روہیلے اپنے زخمیوں کو لے کر شہر کے اندر چلے گئے اور چھ لاشیں یہیں چھوڑ دی ہیں۔ جب سے کہ برٹش حکومت اور والیٔ ریاست حیدرآباد میں اتحاد اور باہمی یگانگت ہے سرکار عظمت مدار کو اس قسم کی ذلت کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہمیں قوی امید ہے کہ جلد از جلد خاطیوں کے خلاف حکومت حیدرآباد سخت ترین اقدام کرے گی''۔

17 / جولائی 1857 کے بعد سے طرہ باز خان کی تلاش جاری تھی۔ ان کی حکمت عملی اور جانبازی و دلیری سے انگریز خائف تھے۔ انگریزوں نے طرہ باز خان کا سر لانے والے کو چار ہزار روپیہ انعام دینے کا اعلان بھی کیا تھا۔ایک دن بعد طرہ باز خان بدحسن خان کے نائب سے گفتگو کرنے مغل گڑہ پہنچے تو جاسوسوں نے ان کا تعاقب کیا اور فوجی دستے نے گولی مار کر طرہ باز خان کے گھوڑے کو ہلاک کردیا۔طرہ باز خان اس مقابلے میں زخمی ہوگئے اور انھیں گرفتار کرکے شہر لایا گیا۔ کچھ عرصے بعد طرہ باز خان انگریزوں کی قید سے فرار ہوگئے۔اس مرتبہ طرہ باز خان کی گرفتاری کے لیے پانچ ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا۔وہ ایک عرصے تک جنگلوں میں روپوش رہے۔طرہ باز خان کو توپراں کے تعلقہ دار نے بالآخر گرفتار کرلیا اور وہ غداروں کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ پہلی گرفتاری کے بعد جب طرہ باز خان پر مقدمہ چلایا گیا تھا تو انھوں نے اپنا اقبالی بیان دیا تھا کہ ''میں نے ریذیڈنسی پر حملہ کیا تھا اور میں اپنے مذہب کے نام پر فرنگیوں کو ہندوستان سے باہر نکال دینا چاہتا ہوں۔طرہ باز خان کی لاش کئی دن تک بازار میں لٹکائی گئی تاکہ دوسرے باغیوں کو عبرت حاصل ہو۔آج حیدرآباد میں نہ ریذیڈنٹ موجود ہے اور نہ وہ برج باقی ہے جہاں سے حریت پسندوں پر گولیاں چلائی گئی تھیں لیکن طرہ باز خان کے نام سے منسوب شاہراہ سے گذرنے والوں کا سر ان کے احترام میں جھک جاتا ہے۔

مولوی علاءالدین 1275ھ مطابق 1859 تک موضع منگل پلی میں روپوش رہے اور بالآخر یہیں گرفتار ہوئے اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ مولوی علاءالدین کو کالے پانی کی سزا تجویز کی گئی۔انڈمان میں علاءالدین نے 1884 میں انتقال کیا۔

حیدرآباد میں انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے والوں میں روہیلہ جمعدار جہانگیر خان، راجہ شواپور، تعلقہ بسمت کے پیرزادگان غلام حسین اور غلام محسن، راؤ صاحب اور بابا صاحب کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ نانا صاحب پیشوا اور تانتیا ٹوپے نے بھی جنگ آزادی کے سلسلے میں اپنے وکلا حیدرآباد روانہ کیے تھے۔ یہ دونوں خفیہ طور پر حیدرآباد آکر عوام کو برطانوی سامراج کے مظالم کے خلاف اکسایا کرتے تھے اور رات میں دیواروں پر پوسٹر چسپاں کیا کرتے تھے۔ یہ سب حریت پسند سرفروش تھے جنھوں نے بڑی جوانمردی اور جرأت کے ساتھ بدیسی طاقت سے ٹکر لی اور وطن کی مقدس سرزمین کو برطانوی سامراج کے تسلط سے نجات دلانے کی کوشش میں اپنی جان کی بازی لگادی۔

مختصر یہ کہ حیدرآباد میں 1857 کی جد و جہد کی داستان بہت طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ حیدرآباد کے حریت پسندوں نے دوہری زنجیروں میں گرفتار ہونے کے باوجود جنگ آزادی میں اپنا تاریخی رول ادا کرکے اپنی وطن دوستی اور جانبازی کا ثبوت دیا ہے۔ ●●●

قانون کی باتیں

گذشتہ سے پیوستہ

خواجہ عبدالمنتقم

خواتین کے خلاف خانگی تشدد کے خاتمے کا قانون

9- **قواعد بنانے کا اختیار:** (1) مرکزی حکومت، سرکاری گزٹ میں اعلان نامے کے ذریعہ اس ایکٹ کی توضیحات کے عمل درآمد کے لیے قواعد بنا سکے گی۔

(2) خاص طور پر اور متذکرہ اختیارات کی عمومیت کو مضرت پہنچائے بغیر ایسے قواعد کی رو سے حسب ذیل امور کی نسبت توضیع کی جا سکے گی، یعنی:—

(الف) وہ فارم جس میں اور وہ طریقہ جس سے اور ایسے افراد جن کے ذریعہ دفعہ 3 کی ذیلی دفعہ (2) میں محولہ تحائف کی کوئی فہرست رکھی جائے گی اور ان سے متعلق دیگر امور؛ اور

(ب) اس ایکٹ کی عمل آوری کی بابت پالیسی اور کارروائی میں بہتر ربط دہی۔

(3) اس دفعہ کے تحت بنایا ہوا ہر ایک قاعدہ بنائے جانے کے بعد جس قدر جلد ہو سکے 30 دن کی مجموعی مدت تک پارلیمنٹ کے ہر ایک اجلاس میں جب اس کا اجلاس جاری ہو، رکھا جائے گا، اور یہ مدت ایک ہی اجلاس یا دو یا زائد یکے بعد دیگرے آنے والے اجلاسوں پر مشتمل ہو سکتی ہے، اور اگر مذکورہ بالا اجلاس یا یکے بعد دیگرے اجلاسوں کے فوراً بعد ہونے والے اجلاس کے منقضی ہونے سے پہلے دونوں ایوان اس قاعدے میں کسی قسم کا رد و بدل کرنے پر اتفاق کریں یا دونوں ایوان متفق ہوں کہ اس قاعدے کو نہ بنانا چاہیے تو اس کے بعد وہ قاعدہ ایسی رد و بدل کی ہوئی صورت میں مؤثر ہوگا یا کوئی اثر نہ رکھے گا، جیسی کہ صورت ہو، تاہم، ایسا کوئی رد و بدل یا کالعدمی اس قاعدے کے تحت ماقبل کیے گئے، کسی امر کے جواز کو مضرت نہ پہنچائے گی۔

10- **ریاستی حکومت کا قواعد بنانے کا اختیار:** (1) ریاستی حکومت، سرکاری گزٹ میں اعلان نامے کے ذریعہ اس ایکٹ کی توضیحات کے عمل درآمد کے لیے قواعد بنا سکے گی۔

(2) خاص طور پر اور متذکرہ اختیارات کی عمومیت کو مضرت پہنچائے بغیر ایسے قواعد کی رو سے حسب ذیل امور کی نسبت توضیع کی جا سکے گی، یعنی:—

(الف) دفعہ 8-ب کی ذیلی دفعہ (2) کے تحت ممانعت جہیز سے متعلق افسران کے ذریعے انجام دیے جانے والے اضافی کارہائے منصبی؛

(ب) وہ حدود اور شرائط جن کے تحت ممانعت جہیز سے متعلق افسر دفعہ 8-ب کی ذیلی دفعہ (3) کے تحت اپنے فرائض منصبی انجام دے گا۔

(3) اس دفعہ کے تحت بنایا گیا ہر ایک قاعدہ بنائے جانے کے بعد جس قدر جلد ہو سکے ریاستی اسمبلی کے روبرو رکھا جائے گا۔

نوٹ:- اس ایکٹ میں مختلف ریاستوں میں مختلف ترامیم کیے ہیں لہٰذا متعلقہ ریاستوں میں اس ایکٹ کا کسی بھی طرح استعمال کرنے والے قارئین کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی بھی کارروائی میں ان ترامیم کو ملحوظ خاطر رکھیں اور اس کے مطابق کارروائی کریں۔

ممانعت جہیز (فہرست تحائف دولہا۔دلہن) قواعد، 1985

عام قانونی قاعدہ 664 (غیر معمولی)...... مرکزی حکومت، ممانعت، جہیز ایکٹ، (1961 کا 28) کی دفعہ 9 کے ذریعہ عطا کیے گئے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے، مندرجہ ذیل قواعد بناتی ہے:......

1- مختصر نام اور نفاذ: (1) ان قواعد کا مختصر نام ممانعت جہیز (فہرست تحائف دولہا، دلہن) قواعد 1985 ہے۔

(2) یہ 2 اکتوبر 1985 کو نافذ ہوں گے جو ممانعت جہیز (ترمیم) ایکٹ، 1984 (1984 کا 63) کے نافذ ہونے کے لیے متعین تاریخ ہے۔

2- قواعد جن کے مطابق تحائف کی فہرستیں رکھی جائیں گی: (1) شادی کے وقت جو تحائف دلہن کو دیے جاتے ہیں ان کی ایک فہرست دلہن رکھے گی۔

(2) شادی کے وقت جو تحائف دولہا کو دیے جاتے ہیں ان کی ایک فہرست دولہا رکھے گا۔

(3) ذیلی قاعدہ (1) یا ذیلی قاعدہ (2) میں صراحت کردہ تحائف کی فہرست،.....

(الف) شادی کے وقت یا شادی کے بعد جتنی جلد ممکن ہو تیار کی جائے گی؛

(ب) تحریری ہوگی؛

(ج) اس میں مندرجہ ذیل چیزوں کی فہرست ہوگی.....

(i) ہر تحفہ کی مختصر تفصیل؛

(ii) تحفہ کی تخمینی قیمت؛

(iii) اس شخص کا نام، جس نے تحفہ دیا ہے، اور

(iv) اگر وہ شخص، جس نے تحفہ دیا ہے دلہن یا دولہا کا رشتہ دار ہے تو ایسے رشتہ داری کی تفصیل؛

(د) دولہا اور دلہن کے اس پر دستخط ہوں گے۔

تشریح-1: جہاں دلہن دستخط نہیں کرسکتی، وہاں وہ اسے فہرست پڑھ کر سنائی جانے کے بعد اور اس شخص کے، جس نے فہرست میں کیے گئے اندراجات کو اس طرح پڑھ کر سنایا ہے، اس فہرست پر دستخط حاصل کرنے کے بعد اپنے دستخط کرنے کے بدلے اپنے انگوٹھے کا نشان لگا سکے گی۔

تشریح-2: جہاں دولہا دستخط نہیں کرسکتا وہاں وہ اسے فہرست پڑھ کر سنائی جانے کے بعد اور اس شخص کے، جس نے فہرست میں کیے گئے اندراجات کو اس طرح پڑھ کر سنایا ہے، اس فہرست پر دستخط حاصل کرنے کے بعد اپنے دستخط کرنے کے بدلے اپنے انگوٹھے کا نشان لگا سکے گا۔

(4) دولہا یا دلہن، اگر ایسا چاہے تو ذیلی قاعدہ (1) یا ذیلی قاعدہ (2) میں مصرحہ فہرستوں میں سے کسی ایک پر یا دونوں پر اپنے کسی رشتے دار یا رشتہ داروں یا شادی کے وقت حاضر کسی دیگر شخص یا اشخاص کے دستخط حاصل کرسکتی ہے۔

باب-4
بعض جرائم کے ارتکاب کی بابت قیاس

قیاس (Presumption) ایک قانونی اصطلاح ہے جس کا عام قانون میں استعمال ہوتا ہے۔ قیاس دو قسم کے ہوتے ہیں ایک قیاس واقعاتی اور دوسرا قیاس قانونی۔ قانونی قیاس میں عدالت کو قانون کی تعبیر سے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے لیے اختیار تمیزی عطا نہیں کیا جاتا بلکہ انھیں تاکید کے طور پر یہ حکم دیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں صورت حال میں وہ فلاں فلاں نتیجہ اخذ کریں گے۔ البتہ مخلوط قیاس یعنی قانونی و واقعاتی قیاس کی صورت میں عدالت کو حسب صورت و حسب حالات نتیجہ اخذ کرنے کا اختیار تمیزی حاصل ہے۔

● بچے کے جائز ہونے کی بابت قیاس
شہادت ایکٹ، 1872

112- شادی کے دوران بچے کی پیدائش، اس کے جائز ہونے کا قطعی ثبوت: یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی شخص کی پیدائش اس کی ماں اور کسی مرد کے درمیان جائز طور پر کی گئی شادی کا رشتہ قائم رہنے کے دوران ہوئی ہے یا ازدواج انفساخ کے 280 دن کے اندر اور یہ کہ ماں نے اس دوران پھر سے شادی نہیں کی ہے، تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہوگا کہ وہ اس شخص (مرد) کی جائز اولاد ہے۔

● شادی شدہ عورت کے ذریعہ خودکشی کی ترغیب اور جہیز موت کی بابت قیاس

113 الف- کسی شادی شدہ عورت کے ذریعہ خودکشی کی ترغیب کی بابت قیاس: جہاں یہ مدعا زیرغور ہو کہ کسی عورت کو خودکشی کرنے کے لیے اس کے شوہر یا اس کے شوہر کے کسی رشتہ دار نے ترغیب دی تھی اور یہ کہ یہ بات واضح کردی جائے کہ اس نے اپنی شادی کی تاریخ سے 7 سال کی مدت کے دوران خودکشی کی ہے اور یہ کہ اس کے شوہر یا اس کے شوہر کے کسی رشتہ دار نے اس کے ساتھ کوئی ظالمانہ برتاؤ کیا تھا تو عدالت معاملے سے متعلق تمام حالات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ قیاس کرسکتی ہے کہ ایسی خودکشی کے لیے اس کے شوہر یا اس کے شوہر کے کسی رشتہ دار نے ترغیب دی تھی۔

113ب- جہاں یہ مدعا زیر غور ہو کہ کسی شخص نے کسی عورت کی جہیز کے لیے جان لی ہے اور موت کے فوراً بعد یہ بات واضح کر دی جائے کہ ایسی عورت کے ساتھ جہیز کی مانگ کے لیے یا اس سلسلے میں کسی قسم کا کوئی ظالمانہ برتاؤ کیا گیا تھا یا اسے پریشان کیا گیا تھا تو یہ قیاس کیا جائے گا کہ ایسے شخص نے جہیز موت کا ارتکاب کیا ہے۔

تشریح: اس دفعہ کے اغراض کے لیے "جہیز موت" کے وہی معانی ہوں گے جو اس کے مجموعہ تعزیرات بھارت (1860 کا 45) کی دفعہ 304ب میں ہیں)

باب-5

خواتین کی غیر شائستہ شبیہ پیش کرنے سے متعلق قانون

یہ قانون ایسے اشتہارات، اشاعتوں، تحریروں، پینٹنگوں، تصویروں اور دیگر ایسی باتوں پر پابندی عائد کرنے کے لیے بنایا گیا ہے جن میں عورت کی غیر شائستہ شبیہ پیش کی گئی ہو۔

خواتین کی غیر شائستہ شبیہ (ممانعت) ایکٹ، 1986

(The Indecent Representation of Women (Prohibition) Act)

(ایکٹ نمبر 60 بابت 1986)

کچھ اہم دفعات

-3 کوئی بھی شخص کوئی بھی ایسا اشتہار نہ تو شائع کرے گا نہ کروائے گا، نہ اس کی اشاعت یا نمائش کا انتظام کرے گا، نہ اس میں حصہ لے گا جس میں عورت کی کسی بھی طرح غیر شائستہ شبیہ پیش کی گئی ہے۔

-4 کوئی بھی شخص کوئی بھی ایسی کتاب، پمفلٹ، پیپر، سلائڈ، فلم، تحریر، ڈرائنگ، پینٹنگ، فوٹوگراف، شبیہ یا تصویر جس میں کسی عورت کی کسی بھی شکل میں غیر شائستہ شبیہ پیش کی گئی ہو، نہ تو پروڈیوس کرے گا، نہ کروائے گا، نہ فروخت کرے گا، نہ کرایے پر دے گا، نہ تقسیم کرے گا، نہ سب جگہ بھیجے گا اور نہ ہی ڈاک کے ذریعے اسے ارسال کرے گا۔

(اس دفعہ میں اس قسم کے مواد کو اس دفعہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے جیسے ان کا مفاد عامہ و مذہبی اغراض کے لیے استعمال یا آثار قدیمہ، مندروں وغیرہ میں انھیں رکھا جانا یا ان کا مختلف مقامات پر یا مورتیوں کی شکل میں کندہ ہونا وغیرہ)۔

-6 کوئی بھی شخص جو دفعہ 3 یا دفعہ 4 کی توضیحات کی خلاف ورزی کرے گا اسے پہلی مرتبہ خلاف ورزی کرنے پر کسی بھی طرح کی 2 سال تک کی قید کی سزا دی جائے گی اور ساتھ میں 2 ہزار روپے تک کا جرمانہ کیا جائے گا اور اگر وہ دوبارہ یا بار بار اسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے کم از کم 6 ماہ کی قید جو بڑھا کر 5 سال کی جا سکتی ہے اور ساتھ میں کم از کم 10 ہزار روپے جرمانہ جسے بڑھا کر 10 لاکھ روپے تک کیا جا سکتا ہے، کی سزا دی جا سکتی ہے۔

باب-6

عصمت فروشی اور عصمت فروشی کے اڈے چلانے اور فاسقانہ بیوپار سے متعلق قانون

یہ قانون فاسقانہ بیوپار کے انسداد کے لیے 9 مئی 1950 کو نیویارک میں ہونے والی بین الاقوامی کنونشن میں لیے گئے فیصلوں کی روشنی میں وضع کیا گیا ہے۔ اس قانون کا مقصد عصمت فروشی، عصمت فروشی کے اڈے چلانا اور اسی طرح کے فاسقانہ بیوپار پر پابندی لگانا ہے۔

فاسقانہ بیوپار (انسداد) ایکٹ، 1956

(The Immoral Traffic (Prevention) Act)

(ایکٹ نمبر 104 بابت 1956)

کچھ اہم دفعات

-3 کوئی بھی شخص جو عصمت فروشی کا اڈہ چلاتا ہے یا اس کا انتظام کرتا ہے یا اس کے انتظام و انصرام کے لیے کوئی کام کرتا ہے یا کوئی امداد بہم پہنچاتا ہے تو اسے پہلی مرتبہ ایسا جرم کرنے کے لیے کم از کم ایک سال کی اور زیادہ سے زیادہ 3 سال کی قید با مشقت اور ساتھ میں 2 ہزار روپے تک کے جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے اور دوسری بار یا بار بار ایسا کرنے پر کم سے کم 2 سال اور زیادہ سے زیادہ 5 سال تک کی قید با مشقت کی اور ساتھ میں 2 ہزار روپے تک کے جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے۔

(اس کے علاوہ کرایے دار، پٹے دار، مکان مالک یا دیگر کسی ایسے شخص کو بھی، جس کے قبضے میں وہ مقام یا جگہ اس وقت ہو جان بوجھ کر اس جگہ کا اس مقصد کے لیے استعمال کرے یا کروائے تو اسے بھی پہلی مرتبہ ارتکاب جرم کے لیے 2 سال تک کی قید اور 2 ہزار روپے تک کے جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے لیکن دوسری بار یا بار بار ایسا کرنے پر یہ سزا جرمانے کے ساتھ ساتھ بڑھا کر 5 سال کی جا سکتی ہے)۔

5- اگر کوئی شخص جو—

(الف) کسی شخص کو اس کی مرضی سے یا اس کی مرضی کے بغیر عصمت فروشی کے لیے آمادہ کرتا ہے یا ایسا کرنے کا اقدام کرتا ہے؛ یا

(ب) کسی شخص کو بہلا پھسلا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ اس نیت سے لے جاتا ہے کہ وہ اس کا عصمت فروشی کے لیے استعمال کرے گا اور اسے کسی عصمت فروشی کے اڈے میں رکھے گا؛ یا

(ج) کسی شخص کو ایک جگہ سے دوسری جگہ عصمت فروشی کے لیے لے جاتا ہے یا لے جانے کا اقدام کرتا ہے یا ایسا کرواتا ہے؛ یا

(د) عصمت فروشی کرواتا ہے یا اس کے لیے بہلاتا پھسلاتا ہے؛

تو اسے کم از کم 3 سال کی اور زیادہ سے زیادہ 7 سال کی قید بامشقت اور ساتھ میں 2 ہزار روپے تک کے جرمانے کی سزا دی جاسکتی ہے اور اگر اس ذیلی دفعہ کے تحت کوئی جرم کسی شخص کی مرضی کے خلاف کیا جاتا ہے تو سزا کو بڑھا کر 7 سال سے 14 سال کیا جاسکتا ہے:

مگر شرط یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جس کی نسبت اس ذیلی دفعہ کے تحت کسی جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے،—

(i) بچہ ہے تو اس ذیلی دفعہ کے تحت سزا کو بڑھا کر کم از کم 7 سال اور زیادہ سے زیادہ عمر قید کی سزا کیا جاسکتا ہے؛ اور

(ii) نابالغ ہے تو اس ذیلی دفعہ کے تحت سزا کو بڑھا کر کم از کم 7 سال اور زیادہ سے زیادہ 14 سال کی قید بامشقت کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ دفعہ 7 میں عام مقامات پر عصمت فروشی کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس کا نفس موضوع درج ذیل ہے:

7- جو کوئی عصمت فروشی کا بیوپار ذیلی دفعہ (3) کے تحت نوٹیفائی کیے گئے علاقے یا علاقوں کی حدود میں کرتا ہے یا کسی عبادت گاہ، تعلیمی ادارے، ہوٹل، اسپتال، نرسنگ ہوم یا کسی ایسے دیگر مقام سے، جس کی قانون کے تحت صراحت کی جائے، 200 کلومیٹر کے اندر کرتا ہے تو اسے 3 مہینے تک کی سزا دی جاسکتی ہے لیکن اگر یہی جرم کسی بچے یا نابالغ کی نسبت کیا جاتا ہے تو اس کے لیے کسی بھی طرح کی کم از کم 7 سال کی سزا اور زیادہ سے زیادہ عمر قید کی سزا یا 10 سال تک کی سزا دی جاسکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

8- اس دفعہ کے مطابق اگر کوئی شخص کسی عام جگہ پر (کسی بلڈنگ یا مکان کی کھڑکی یا بالکونی میں بیٹھ کر یا کسی دیگر طریقے سے) اشارے، کنایے یا اسی طرح کی کسی دیگر حرکت کے ذریعے کسی کو عصمت فروشی کے لیے بہلاتا پھسلاتا ہے یا اس کے لیے اس کو آمادہ کرتا ہے یا عصمت فروشی کے لیے عام شائستگی کو زک پہنچاتا ہے تو اسے 6 مہینے تک کی سزا دی جاسکتی ہے یا ساتھ میں 500 روپے تک کا جرمانہ کیا جاسکتا ہے یا دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں اور دوبارہ یا بار بار ایسا کرنے کی صورت میں سزا بڑھا کر ایک سال اور جرمانہ 500 روپے کیا جاسکتا ہے۔

مگر شرط یہ ہے کہ جہاں اس دفعہ کے تحت کوئی جرم اگر کسی مرد کے ذریعے کیا جاتا ہے تو اسے کم سے کم 7 دن کی اور زیادہ سے زیادہ 3 مہینے کی سزا دی جاسکتی ہے۔

باب-7
خاتمۂ حمل سے متعلق قانون

ہماری پارلیمنٹ نے یہ قانون طبی خاتمۂ حمل سے متعلق امور کی ضابطہ بندی اور رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹشنروں کو اس عمل کی اجازت دینے کے لیے بنایا ہے۔

طبی خاتمۂ حمل ایکٹ، 1971
(The Medical Termination of Pregnancy Act)
(ایکٹ نمبر 34 بابت 1971)

کچھ اہم دفعات

3- اس دفعہ کے مطابق (1) مجموعہ تعزیرات بھارت (1860 کا 45) میں کسی بات کے ہوتے ہوئے بھی کسی بھی رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹشنر کو اس مجموعے کے تحت یا نافذالوقت کسی دیگر قانون کے تحت کسی جرم کا قصوروار نہیں ٹھہرایا جائے گا، اگر خاتمۂ حمل اس ایکٹ کی توضیعات کے مطابق کیا گیا ہے۔

(2) ذیلی دفعہ (4) کی توضیعات کے مطابق، کوئی بھی رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹشنر ان صورتوں میں خاتمۂ حمل کرسکتا ہے—

(الف) جب حمل 12 ہفتے سے زیادہ کا نہ ہو، اگر ایسے میڈیکل پریکٹشنر کی نیک نیتی پر مبنی یہ رائے ہو کہ حمل کے جاری رکھنے سے حاملہ عورت کی جان جانے یا اس کی جسمانی یا ذہنی صحت کو شدید مضرت پہنچنے کا خطرہ ہے یا پیدا ہونے والے بچے کو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ وہ جسمانی یا ذہنی بے اعتدالی میں مبتلا ہو کر شدید معذوری کا شکار ہو جائے گا۔

(''خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم''، قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

لالی چودھری

حد چاہیے سزا میں......

ابھی چند گھنٹے پہلے وہ آیا تھا اور میرا وہ تمام ذہنی سکون اور توازن جو زندگی کے سارے زلزلوں اور آندھیوں کو دبا کر، روک کر بڑی احتیاط اور اہتمام سے قائم کیا تھا، سب الٹ پلٹ کر گیا۔

ہوا یہ تھا کہ حرا کا ہوم ورک چیک کرنے کے بعد میں نے ٹی وی آن کیا ہی تھا کہ ہاؤس کیپر نے کہا۔ ''کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے''۔ اور میں نیم تاریک کمرے سے نکل کر باہر پورچ میں آئی تو لمحہ بھر کے لیے حیران رہ گئی۔ آسمانی لیوائز جینز اور آکسفورڈ شرٹ پہنے دائیں ہاتھ میں چابیوں کا گچھا لیے ثاقب کھڑا تھا۔

''ہیلو نبیلہ'' وہ مسکراتے ہوئے ذرا سا آگے بڑھا۔

''آپ کو میرے گھر کا کہاں سے پتہ چلا؟'' اس کی مسکراہٹ میرا دل خون کر گئی۔

''ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے، تم تو...''

''مجھے ڈھونڈنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟'' میں نے پوری بات سُنے بغیر اس سے پوچھا۔

''تمھیں دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا''۔

''پھر دیکھ لیا''   گہری تیز نفرت میرے اندر رینگ   گئی۔

''ابھی کہاں'' وہ بڑی شگفتگی سے بولا۔

''تو تمھیں یہ جان کر ذرا دکھ تو ہوگا ثاقب علی کہ مجھے تم سے ملنے کی ذرہ بھر بھی آرزو نہیں''۔

''اتنی کٹھور نہ بنو نبیلہ۔ میں مدتوں بھٹکنے کے بعد تمھارے پاس آیا ہوں، میرا دل نہ توڑو''۔

''آج تمھیں اپنا دل ٹوٹنے کا ملال ہو رہا ہے ثاقب۔ اس دن میرے دل کا خیال نہیں آیا تھا جب ایک ہزار ڈالر کے ساتھ یہ نوٹ لکھ کر چلے گئے تھے کہ آج سے میرا اور تمھارا رشتہ ختم''۔ اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کے لیے میں نے اپنے ہونٹ سختی سے اندر بھینچ لیے۔

''مجھے معاف کر دو پلیز۔ میں تمھارا گنہگار ہوں۔ مجھے بیٹی سے ملا دو''۔

''حرا سے''۔ زہر خندگی میرے ہونٹوں پہ آ گئی''۔ کیا کہہ کر تم سے ملواؤں جبکہ بہت بچپن میں اسے بتا چکی ہوں کہ اس کا باپ ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا''۔

''نبیلا''۔ وہ ایک دم چیخ پڑا۔

''چلائیے نہیں''۔ قطرہ قطرہ زہر دینے کے بجائے میں نے زہر کا سارا پیالہ ایک ہی بار اس کے منہ کو لگا دیا جسے پی کر وہ ابھی تک زندہ ہے۔ اور اسے گمبھیر بادل کی طرح اُمڈا اور گھبرایا ہوا چھوڑ کر میں اندر آ گئی اور یوں وہ لمحہ جس سے میں خوفزدہ تھی بڑی تیزی سے گزر گیا۔

باہر بڑی خوب صورت اور بڑی تکلیف دہ دنیا اسی طرح دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ڈوبتے سورج کی الوداعی کرنیں یوکلپٹس کی شاخوں پر سونا بکھیر رہی ہیں۔ بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹولیوں کی صورت میں سورج کے اردگرد تیر رہے ہیں۔ ماضی کی یادیں میرے ذہن میں ہلکورے لینے لگی ہیں۔

ایسی ہی شام تھی جب ہم نے اس دھرتی پہ قدم رکھا تھا۔ پاکستان سے یونائیٹڈ اسٹیٹس میں آؤ تو لگتا ہے زمین سے آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ ہر چیز صاف ستھری نکھری ہوئی اُجلی اُجلی اور کشادہ۔ کوہ قاف کی شہزادیوں کے حُسن کے متعلق بہت کچھ پڑھ اور سُن رکھا تھا لیکن یہ امریکن عورتیں تو

اللہ والوں کی حوروں سے بھی شاید زیادہ حسین تھیں کہ ان کے گورے جسم پہ کوئی زاویہ اور کوئی دائرہ غلط نہ تھا۔ گوری گلابی رنگت، نیلم اور زمرد جیسی نیلی اور سبز آنکھیں، یاقوتی ہونٹ سچے موتیوں جیسے دانت اور پگھلے سونے جیسے سنہری بال، جلد اتنی شفاف ملائم اور چکنی کہ نظر پھسل جائے اور اچھے بھلے پارسا کا ایمان ڈانواں ڈول ہو جائے۔

ثاقب کام سے گھر آتا تو ہم ساحل پہ گھومنے نکل جاتے، مجھے تلوؤں میں گدگدی کرتی ہوئی بھیگی ریت بہت اچھی لگتی۔ میں پانی میں چھپکل چھپکل چھینٹے اڑاتی دوڑتی جاتی۔ اسی طرح جیسے بچپن میں لوسن اور مٹالے کے کھیتوں میں رنگ برنگی تتلیوں کے پیچھے بھاگا کرتی تھی۔

''بیلا تھک جاؤ گی''۔ ثاقب مجھے اپنے قریب کھینچ لیتا اور اس کی گرم گرم باہوں کے حصار میں مجھے اپنا جسم چٹختا محسوس ہوتا۔ انگلیوں کی پوروں میں چنگاریاں بھر جاتیں، ساری دھرتی پر کرنوں کی برسات ہونے لگتی۔

ایک دن اپنی دوست کو میں نے لکھا۔ ''ربیعہ میں اپنا وطن، امی، بہن بھائی سب سنگی ساتھی چھوڑ کر اس اجنبی دیس میں ہوں جہاں ثاقب کے سوا میرا کوئی نہیں۔ دل چاہتا ہے مجھے اپنی بے کراں تنہائی کا احساس ہو اور تنہائی کی اس رکی رکی سی فضا میں تم لوگوں کی یاد میں آنکھوں سے گنگا جمنا بہاؤں اور تمہیں لکھوں کہ علی پور کے آم اور انار کے باغوں میں کھیلنے والی بیلا یہ سوچ سوچ کر روتی ہے کہ امبیوں سے لدی ٹہنی پہ بیٹھی کوئل اس کی یاد میں کوکتی ہوگی، لیکن میں اتنی خوش ہوں کہ مجھے کوئی یاد نہیں آتا۔ پتہ نہیں لوگ کیسے اداس ہوتے ہیں؟''

ثاقب کے جاننے والوں میں تین چار فیملی والے تھے، باقی سب چھڑے چھانٹ۔ اپنے کولیگز اور دوستوں میں صرف ثاقب ہی شادی شدہ تھا، وہ بھی اس لیے کہ ثاقب کی امی کے پاس کسی نے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ امریکن عورتوں کے پاس کوئی منتر ہے جس کے زور سے وہ اچھے بھلے دیسی آدمی کو کتا بنا کر اپنے پیچھے لگا لیتی ہیں اور وہ ساری عمر دُم ہلاتا ہوا میم کے پیچھے پھرتا رہتا ہے ثاقب کی امی ڈر گئیں اور انھوں نے بتیس دھاریں نہ بخشنے کی دھمکی دے کر ثاقب کو شادی کے لیے رضامند کر لیا مہندی، موتیا، گیندے اور گلاب کے پھولوں کی ملی جلی سہاگن سی خوشبو والے کمرے میں ثاقب نے میرا چہرہ اوپر کرتے ہوئے کہا تھا۔

''میں قسمت کا بہت دھنی ہوں۔ دوہری لاٹری نکل آئی ہے۔ ہیرے جیسی خوب صورت دلہن اور یو ایس اے کا ویزا۔ میں چاند ستاروں سے تمہارا دامن بھرنے کا وعدہ نہیں کرتا لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ تمہیں زندگی بھر مجھ سے کوئی دُکھ نہیں پہنچے گا اور میں تمہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا''۔

اور ہوا بھی یہی، وہ رانجھے کی طرح مجھے پیار کرتا اور اپنی چھیڑ چھاڑ سے ہر وقت محظوظ رکھتا۔ اس کے سارے دوست اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ رہتے تھے۔ کوئی ڈائین تھی کوئی جوائین، کولنڈا تھی تو کوئی پولا۔

''ثاقب! گلی محلوں میں ایک سے ایک خوب صورت لڑکی نظر آتی ہے۔ پاکستانی مردوں کی بصارت چلی گئی ہے کہ امریکہ کا کوڑا کباڑا لے کر اتراتے پھرتے ہیں''۔ میں ثاقب سے پوچھتی۔

''تم مرد کی نفسیات سے ناواقف ہو مائی ڈیئر۔ پاکستان سے آئے ہوئے لڑکوں کو بھی لڑکیاں روغنی نان اور مرغ مسلم لگتی ہیں''۔ یہ انکشاف تو بعد میں ہوا، جنگل صورت والی لڑکیوں کے اپنے اسٹینڈرڈ اور آئیڈیل ہوتے ہیں وہ ان دیسی آدمیوں کو کہاں گھاس ڈالتی ہیں، جنھیں کوئی امریکن یا یورپین آدمی قبول نہ کرتا ہو وہ سیکیورٹی کی خاطر دیسی مردوں سے چمٹ جاتی ہیں اور یہ بیچارے سادہ لوح عقل کے اندھے انھیں یوں سینے سے لگائے پھرتے ہیں جیسے گولڈ میڈل ہو''۔

ایک دن یونیورسٹی سے واپس آتے ہوئے میرے دماغ میں ایک عجیب سا خیال آ وارد ہوا۔

''ثاقب کبھی تم نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی جو خصوصیات بتائی ہیں وہ سب یہاں موجود ہیں''۔

''کیا مطلب؟'' اسے میری ذہنی حالت پہ شبہ سا ہوا۔

''مطلب یہ کہ موسم معتدل نہ گرمی نہ سردی۔ دودھ اور شہد کی بہتات، انگور، انار اور انواع و اقسام کے فروٹ ہر موسم کا پھل دستیاب ہے۔ گورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہیں۔ جس چیز کو جس وقت دل چاہے جا کر مارکیٹ سے لے آؤ۔ کہیں یہی تو جنت نہیں''۔

ثاقب یوں کھل کھلا کر ہنسا جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنا ہو۔

''اور ایک حور ڈاکٹر انوار کے پہلو میں ہے'' ثاقب نے بائیں لین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میں یہ دیکھ کر سن رہ گئی کہ ڈاکٹر صاحب ایک ہاتھ سے اس عورت کا نیم عریاں بدن سہلا رہے تھے۔ بیوی اور دو بچوں کے ہوتے ہوئے یہ چلن۔ نرگس کا رنگ گورا نہ سہی پھر بھی اس رشتے کی اپنی تقدیس ہوتی ہے یہ سوچ کر میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہی، ویسے بھی ان دنوں میری طبیعت بوجھل رہتی تھی۔ کچے کچے دن تھے۔ سارا دن لیموں پہ نمک ڈال کر چاٹتی رہتی۔ بار بار نرگس کا خیال آتا اور میں سوچتی کہ اگر اسے پتا چل جائے تو اس پہ کیا گزرے گی۔ اگر وہ اس تعلق کو بوجھ سمجھ کر توڑنے کی کوشش کرے بھی تو دو معصوم بچے راستے میں

ثاقب تم اتنے بزدل تھے کہ میرا سامنا بھی نہ کرسکے۔ جب تم اپنی چیزیں لے کر جا رہے تھے تو بیٹی کو پیار کرکے فی امان اللہ کہا تھا یا اسے سوتی چھوڑ کر چوروں کی طرح اس کی زندگی سے نکل گئے تھے؟ ساری شام میں نے روتے گزار دی۔ یہ کیسا ہمسفر تھا جو چند قدم چل کر ساتھ چھوڑ گیا۔ عمر بھر کا یہ بندھن کیسا تھا جو پل بھر میں ٹوٹ گیا۔ میرے سامنے ساری دنیا ساری زندگی خالی پڑی تھی۔ بھیانک تاریک خلاء کا طوفانی سمندر جس کا کوئی کنارا نہ تھا۔

نرگس کو بہت دنوں بعد پتا چلا، وہ اسی وقت چلی آئی اور میں اس سے لپٹ کر روتی رہی۔

"بیلا حوصلہ کرو" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"حوصلہ کہاں سے لاؤں نرگس"۔ آنسوؤں کا اتنا زبردست ریلا آیا کہ میں آگے کچھ نہ بول سکی۔

"یہ سب کچھ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ تم جو اتنی پیاری اور معصوم تھیں"۔ نرگس نے دل ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی آواز میں پوچھا۔

"میں بھی یہی سوچتی رہی ہوں نرگس کہ میں جو اتنی مخلص اتنی ذہین اور وسیع القلب تھی۔ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ ثاقب مجھے تھرڈ کلاس لوگوں کی طرح کیوں چھوڑ کر چلا گیا۔ لیکن شاید زندگی ہر کسی سے اپنے نذرانہ وصول کرتی ہے اور جاہل اور تعلیم یافتہ، غبی اور اعلیٰ ذہن میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی۔ شاید وہ امیچور تھا جو بیٹی کی ذمہ داری سے گھبرا گیا یا امریکن عورت کے شفاف رنگ کے سامنے میرا رنگ گدلا پڑ گیا"۔

"اتنی موربڈ نہ بنو۔ جس کے ساتھ وہ پھرتا ہے، چھ فٹ کی لم ڈھینگ بے ڈھنگی ہے"۔

پھر تو جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر ساری کمیونٹی میں پھیل گئی کہ ثاقب بیلا کو چھوڑ گیا۔ میرے گھر موت والے گھر کی طرح لوگوں کا جم غفیر رہتا اور جتنے منہ اتنی ہی باتیں اور مشورے۔ "واپس پاکستان چلی جاؤ۔ تمہارے آگے پہاڑ سی جوانی پڑی ہے اکیلی کیسے زندگی گزارو گی"۔

"اللہ نے مجھے بھی مردوں کی طرح دو ہاتھ دو پاؤں دیے ہیں اور میری ذہنی صلاحیت اگر ان سے برتر نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں۔ میں کما سکتی ہوں"۔

"عورت کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی اور مرد کے بغیر گھر کا..."

"یہ سب عورتوں کی ذہنی صلاحیت سلب کرنے والی باتیں ہیں"۔ میں نے پوری بات سنے بغیر کہا "اور میں دکھاؤں گی کہ میری کمائی میں کتنی برکت ہے"۔

"ٹھیک ہے آرام سے یہاں رہو۔ سال چھ مہینے میں ثاقب کا دل اس حرافہ سے بھر جائے گا تو اپنے گھر لوٹ آئے گا۔ اس نے تو صرف ایک بار ہی لکھا ہے کہ میرا اور تمہارا رشتہ ختم ہے۔ یہ طلاق شرعی طور پر مکمل نہیں ہوئی"۔ ایک اور آواز آئی۔

"ایک بار کہہ دیا یا ایک ایک دفعہ کرکے تین بار کہہ دیا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں کوئی کٹھ پتلی نہیں کہ ڈور کھینچ کر جب چاہا گلے لگا لیا، جب چاہا پرے دھکیل دیا۔ شرعی طور پر یہ طلاق جائز ہو یا ناجائز، میری نظر میں وہ مقدس رشتہ اب ختم ہو چکا ہے"۔ میں نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

چار سال تک میں نے ساتوں دن دو دو جاب کیے، بیٹی کو پالا اور بزنس میں ڈگری لی اور اب جب میں نے اپنے اور حرا کے لیے مردوں کی طرح جینا سیکھ لیا تو ثاقب علی تم چلے آئے۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگنے۔ بتاؤ تمہیں کس کس گناہ کی معافی دوں۔ اپنی محبت کی تذلیل کی۔ میرے خلوص کی دھجیاں بکھیر دینے کی یا پردیس میں بے سہارا چھوڑ دینے کی۔ اور اگر میں ان سب گناہوں کی معافی دے بھی دوں تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس آدمی کو معاف کرسکتی ہوں جو اپنی معصوم بچی کو پلے پن میں اکیلی چھوڑ کر چلا گیا اگر خدانخواستہ گھر میں آگ لگ جاتی اور اسے کچھ ہو جاتا۔

آنسو مسلسل ساون کی جھڑی کی طرح میری آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

ہاؤس کیپر نے آکر کہا "وہ آدمی ابھی تک وہیں کھڑا ہے، اس نے مجھے یہ نوٹ لکھ کر دیا ہے"۔

میں نے کاغذ ہاؤس کیپر سے لے لیا۔ ثاقب نے اتنا ہی لکھا تھا:

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر میز سے پن اٹھایا اور اسی کاغذ کے دوسری طرف لکھا:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

یہ کاغذ ہاؤس کیپر کو دے کر میں خود کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس نے جواب پڑھا اور کاغذ کو تہہ کرکے جینز کے پیچھے والی جیب میں رکھ لیا۔ پتا نہیں یہ انداز ضبط تھا کہ احساسِ شکست۔ اس نے نظریں ایک بار بھی اوپر نہ اٹھائیں اور یونہی سر جھکائے ڈگمگاتے قدموں سے چلا گیا۔

اس وقت سے مسلسل بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ثاقب یہ تم آئے تھے یا کوئی طوفان، جو میری زندگی کا سارا توازن ضبط اور عزم اپنے ساتھ بہا لے گیا۔

ثاقب تم اتنے بزدل تھے کہ میرا سامنا بھی نہ کر سکے۔ جب تم اپنی چیزیں لے کر جا رہے تھے تو بیٹی کو پیار کر کے فی امان اللہ کہا تھا یا اسے سوتی چھوڑ کر چوروں کی طرح اس کی زندگی سے نکل گئے تھے؟ ساری شام میں نے روتے گزار دی۔ یہ کیسا ہمسفر تھا جو چند قدم چل کر ساتھ چھوڑ گیا۔ عمر بھر کا یہ بندھن کیسا تھا جو پل بھر میں ٹوٹ گیا۔ میرے سامنے ساری دنیا ساری زندگی خالی پڑی تھی۔ بھیانک تاریک خلاء کا طوفانی سمندر جس کا کوئی کنارا نہ تھا۔

نرگس کو بہت دنوں بعد پتا چلا، وہ اسی وقت چلی آئی اور میں اس سے لپٹ کر روتی رہی۔

''بیلا حوصلہ کرو'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''حوصلہ کہاں سے لاؤں نرگس''۔ آنسوؤں کا اتنا زبردست ریلا آیا کہ میں آگے کچھ نہ بول سکی۔

''یہ سب کچھ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ تم جو اتنی پیاری اور معصوم تھیں''۔ نرگس نے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی آواز میں پوچھا۔

''میں بھی یہی سوچتی رہی ہوں نرگس کہ میں جو اتنی مخلص اتنی ذہین اور وسیع القلب تھی۔ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ ثاقب مجھے تھرڈ کلاس لوگوں کی طرح کیوں چھوڑ کر چلا گیا۔ لیکن شاید زندگی ہر کسی سے اپنے نذرانہ وصول کرتی ہے اور جاہل اور تعلیم یافتہ، غبی اور اعلیٰ ذہن میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی۔ شاید وہ اتنا ہی کمزور تھا جو بیٹی کی ذمہ داری سے گھبرا گیا یا امریکن عورت کے شفاف رنگ کے سامنے میرا رنگ گدلا پڑ گیا''۔

''اتنی مور بڈ نہ ہو۔ جس کے ساتھ وہ پھرتا ہے، چھ فٹ کی لم ڈھینگ بے ڈھنگی ہے''۔

پھر تو جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر ساری کمیونٹی میں پھیل گئی کہ ثاقب بیلا کو چھوڑ گیا۔ میرے گھر موت والے گھر کی طرح لوگوں کا جم غفیر رہتا اور جتنے منہ اتنی ہی باتیں اور مشورے۔ ''واپس پاکستان چلی جاؤ۔ تمہارے آگے پہاڑ سی جوانی پڑی ہے اکیلی کیسے زندگی گزارو گی''۔

''اللہ نے مجھے بھی مردوں کی طرح دو ہاتھ دو پاؤں دیے ہیں اور میری ذہنی صلاحیت اگر ان سے برتر نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں۔ میں کما سکتی ہوں''۔

''عورت کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی اور مرد کے بغیر گھر کا...''

''یہ سب عورتوں کی ذہنی صلاحیت سلب کرنے والی باتیں ہیں''۔ میں نے پوری بات سنے بغیر کہا ''اور میں دکھاؤں گی کہ میری کمائی میں کتنی برکت ہے''۔

''ٹھیک ہے آرام سے یہاں رہو۔ سال چھ مہینے میں ثاقب کا دل اس حرافہ سے بھر جائے گا تو اپنے گھر لوٹ آئے گا۔ اس نے تو صرف ایک بار ہی لکھا ہے کہ میرا اور تمہارا رشتہ ختم ہے۔ یہ طلاق شرعی طور پر مکمل نہیں ہوئی''۔ ایک اور آواز آئی۔

''ایک بار کہہ دیا یا ایک ایک دفعہ کر کے تین بار کہہ دیا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں کوئی کٹھ پتلی نہیں کہ ڈور کھینچ کر جب چاہا گلے لگا لیا، جب چاہا پرے دھکیل دیا۔ شرعی طور پر یہ طلاق جائز ہو یا ناجائز، میری نظر میں وہ مقدس رشتہ اب ختم ہو چکا ہے''۔ میں نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

چار سال تک میں نے ساتوں دن دو دو جاب کیے، بیٹی کو پالا اور بزنس میں ڈگری لی اور اب جب میں نے اپنے اور حرا کے لیے مردوں کی طرح جینا سیکھ لیا تو ثاقب علی تم چلے آئے۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگنے۔ بتاؤ تمہیں کس کس گناہ کی معافی دوں۔ اپنی محبت کی تذلیل کی۔ میرے خلوص کی دھجیاں بکھیر دینے کی یا پردیس میں بے سہارا چھوڑ دینے کی۔ اور اگر میں ان سب گناہوں کی معافی دے بھی دوں تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس آدمی کو معاف کر سکتی ہوں جو اپنی معصوم بچی کو پلے پن میں اکیلی چھوڑ کر چلا گیا اگر خدانخواستہ گھر میں آگ لگ جاتی اور اسے کچھ ہو جاتا۔

آنسو مسلسل ساون کی جھڑی کی طرح میری آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

ہاؤس کیپر نے آ کر کہا ''وہ آدمی ابھی تک وہیں کھڑا ہے، اس نے مجھے یہ نوٹ لکھ کر دیا ہے''۔

میں نے کاغذ ہاؤس کیپر سے لے لیا۔ ثاقب نے اتنا ہی لکھا تھا:

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر میز سے پن اٹھایا اور اسی کاغذ کے دوسری طرف لکھا:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

یہ کاغذ ہاؤس کیپر کو دے کر میں خود کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس نے جواب پڑھا اور کاغذ کو تہہ کر کے جینز کے پیچھے والی جیب میں رکھ لیا۔ پتا نہیں یہ انداز ضبط تھا کہ احساسِ شکست۔ اس نے نظریں ایک بار بھی اوپر نہ اٹھائیں اور یونہی سر جھکائے ڈگمگاتے قدموں سے چلا گیا۔

اس وقت سے مسلسل بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ثاقب یہ تم آئے تھے یا کوئی طوفان، جو میری زندگی کا سارا توازن ضبط اور عزم اپنے ساتھ بہا لے گیا۔

ہوئے کیوں نہ غرق دریا

خورشید جہاں

کالج میں اردو پڑھنے والے طالب علموں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ دیکھ کر ہم حیران تھے اور اردو کی ترویج وترقی کی کامیاب کوشش پر عش عش کرتے تھے۔ واقعی اردو کے اساتذہ نے اس میں ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ لڑکوں میں اردو پڑھنے لکھنے کا شوق جگایا تھا۔ ان کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا ہی یہ ثمرہ تھا کہ آج لڑکے اور لڑکیاں اردو کی بدولت امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو رہے تھے۔

فرسٹ ایئر کی اردو کلاس میں ہم انھیں خیالوں میں گم حاضری لے رہے تھے۔ حاضری ختم ہوتے ہی ہم پڑھانے کے موڈ میں آ گئے۔

''کیا پڑھنا ہے؟''

''سر آج ایم آئی ایل کی کلاس ہے''

''ٹھیک ہے کتاب نکالیے، کیا نام ہے کتاب کا؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''سر منثورات ومنظومات''

''ارے کون سی کتاب ہے یہ۔ کیا سلیبس بدل گیا ہے''

''نہیں سر پہلے والا ہی ہے یہ دیکھیے''

ہم نے کتاب دیکھی واقعی وہی کتاب تھی۔ ہماری سمجھ میں بات آ گئی۔ ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے''۔ پھر ہم منظومات کا حصہ پڑھاتے رہے اور ہمارے ہونہار طالب علم تفہیمی انداز میں سر ہلاتے رہے۔

سیکنڈ ایئر پرنسپل اردو کی کلاس میں جیسے ہی ہم داخل ہوئے طالب علموں سے بھری ہوئی کلاس دیکھ کر ہمارا دل خوش ہو گیا۔ تقریباً ستر اسٹوڈنٹس تھے، جنھوں نے اردو لے رکھی تھی۔ ہم نے بانگِ درا نکالی اور پہلی نظم ابھی شروع ہی کی تھی کہ حکم ہوا۔

''سر لکھوا دیجیے''۔

''ہاں بھئی لکھوا بھی دیں گے لیکن پہلے سمجھ تو لیجیے۔''

''اچھا سمجھائیے۔'' جیسے میرا دل رکھ لیا گیا۔

نظم پڑھاتے پڑھاتے اچانک ہم رُک گئے۔ پوری کلاس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی کہیں کوئی ردعمل نہ تھا۔ کئی لڑکے نیم وا آنکھوں سے کہیں دور دیکھ رہے تھے (ایسا ہمارا خیال تھا ورنہ وہ سو رہے تھے) کہیں ہونٹ اور آنکھوں کی مدد سے اشاروں اشاروں میں کچھ بحث وتکرار ہو رہی تھی۔ ایک جگہ چھینا جھپٹی کا خاموش منظر بھی تھا۔ ہمیں بڑا غصہ آیا۔ لیکن فوراً ہی یہ دیکھ کر ہمارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا کہ پچھلی بنچوں پر بیٹھے کچھ لڑکے نہایت انہماک سے ہمارے لیکچر نوٹ کر رہے تھے۔ آفریں ہے، ایسے ہی لڑکوں کے دم سے اردو کا نام اب تک زندہ ہے۔ پڑھاتے پڑھاتے ہم پچھلی بنچوں کی طرف بڑھ گئے۔ ظاہر ہے اب وہی لڑکے ہماری توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ ہم نے اپنے بولنے کی رفتار ذرا کم کر دی تاکہ ان بچوں کو لیکچر نوٹ کرنے میں دشواری نہ ہو، لیکن قریب پہنچتے ہی میرے دل کو سخت دھکا لگا۔

یہ لڑکے تو کسی دوسرے لڑکے کی نوٹ بک سے نوٹس اتار رہے تھے۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' ہم نے ذرا سختی سے پوچھا۔

''جی، جی وہ ہسٹری کے نوٹس اتار رہے ہیں۔ لیٹ ہو جانے کی وجہ سے ہمارا تھوڑا سا چھوٹ گیا تھا۔ ہم نے سوچا جب تک آپ پڑھا رہے ہیں۔ یہ نوٹس مکمل کر لیں۔''

ہم نے دل ہی دل میں سر پیٹ لیا۔ اتنی دیر تک خواہ مخواہ اپنے جبڑے دکھائے۔ گلا خراب کیا، سر میں درد مول لیا۔ اس سے تو اچھا ہے۔ کلاس میں آتے ہی نوٹس لکھوانا شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ دوسرے دن ہم نے یہی کیا۔

گھنٹی بجتے ہی رجسٹر لے کر ہم کلاس میں جا موجود ہوئے۔ پہلے

دن کی طرح آج کلاس میں بھیڑ نہ تھی بلکہ کلاس خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ خیر اس پر ہم نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ حاضری کے بعد ہم نے اعلان کر دیا۔

''آج سے ہم نوٹس لکھوائیں گے۔''

''جی سر!'' ہمارے اس اعلان کا نہایت جوش و خروش سے استقبال کیا گیا۔

''تو پھر لکھیے''

پوری کلاس میں کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ گونج اٹھی۔ ہر لڑکا اپنی اپنی نوٹ بک کھول کر مستعد ہو بیٹھا تھا۔ وہ لڑکے جو کل سو رہے تھے آج سب سے زیادہ بیدار اور پُرجوش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے قلم بڑی تیز رفتاری سے سطروں پر صفحے سیاہ کر رہے تھے۔

نوٹس لکھواتے لکھواتے ایک بار پھر ہم چونک پڑے۔

''یہ کیا؟ آپ پھر یہاں بیٹھ کر دوسرے مضامین کے نوٹس تیار کر رہے ہیں۔'' ہم نے دو تین لڑکوں کو بائیں سے دائیں قلم چلاتے دیکھ کر سختی سے ٹوکا۔

''نہیں سر ہم آپ ہی کے نوٹس لکھ رہے ہیں۔''

''اگر آپ اردو لکھ رہے ہیں تو پھر...'' کہتے کہتے ہم ان کے قریب چلے گئے: ''یہ کیا ہے؟ یہ تو ہندی ہے۔''

''جی سر! اردو لکھنے میں ذرا وقت ہوتی ہے نا اسی لیے ہندی میں لکھ رہے ہیں۔ گھر جا کر اسے اردو میں فیئر کر لیں گے؟'' اس نے ہماری غلط فہمی دور کرتے ہوئے سمجھایا۔

''جب کلاس میں یہ حال ہے تو امتحان میں کیا ہوگا؟ کیا وہاں بھی آپ یہی کریں گے۔''

''نہیں سر! وہاں ہم کر لیں گے۔'' بڑے یقین سے جواب دیا گیا۔

جی نہیں ہم یہ سب کچھ نہیں سنیں گے۔ آپ اردو میں لکھیے ہم آہستہ آہستہ بولیں گے تاکہ آپ کو دقت نہ ہو۔ ہاں آپ اپنی رفتار بڑھانے کے لیے روزانہ کئی کئی صفحے لکھنے کی عادت ڈالیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

لیکن ہماری حوصلہ افزائی کا یہ اثر ہوا کہ وہ لڑکے یا تو کلاس میں آنے سے کترانے لگے یا اگر کلاس میں ہوتے تو یونہی کاغذ پر قلم چلاتے رہتے لکھتے کچھ بھی نہیں۔ اگر ہم قریب پہنچ جاتے تو وہ لکھنے لگتے۔ ان کی تحریر پر ''خالی جگہوں کو بھرو'' کا گمان ہوتا۔

ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ جیسے ہی ہم کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے طلبا ہمیں گھیر لیتے۔ جب کہ دوسرے ٹیچروں کو یہ شکایت تھی کہ ان کو دیکھ کر لڑکے اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں اور کلاس کے لیے پوچھنا تو در کنار ڈھونڈ والے سے بھی نہیں ملتے۔ اس دن بھی ایسا ہوا۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک جھنڈ ہماری طرف لپکا۔

''سر ابھی ہم لوگوں کا کلاس ہے''۔

''آپ لوگ کس ایئر کے ہیں۔'' ہم اُن کے شوق سے فوراً متاثر ہو گئے۔

''ڈگری پارٹ ٹو آنرز۔''

''اچھا اچھا آپ آنرز کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ چلیے کلاس میں بیٹھیے۔ ہم رجسٹر لے کر آتے ہیں۔''

ہم وقت ضائع کرنے کے عادی نہ تھے۔ کلاس میں پچیس تیس لڑکے بیٹھے منتظر نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انھوں نے کھڑے ہو کر ''السلام علیکم'' کہا ہم نے بھی قرأت کے ساتھ جواب دیا۔

''آپ لوگوں کو غالب پڑھنا ہے نا؟'' ہم نے بغیر کسی تمہید کے اپنی ڈیوٹی شروع کر دی۔

''جی سر''

''کتاب تو آپ لوگ لائے ہی ہوں گے؟'' ہم نے اُن کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں سر آج تو نہیں لائے۔''

''کوئی بات نہیں آئندہ سے لایا کیجیے گا۔ آج غالب کی شخصیت کے بارے میں کچھ ہو جائے۔'' ہم نے گلا صاف کیا اور شروع ہونے والے تھے کہ فرمائش ہوئی۔

''سر نوٹس لکھوا دیجیے ٹائم بہت کم ہے۔ امتحان کی ڈیٹ جلد ہی اناؤنس ہونے والی ہے۔''

اتنے دنوں میں اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ لڑکوں کو صرف نوٹس چاہیے جسے رٹ کر امتحان پاس کر سکیں پھر بھی سوچا آنرز کے طالب علم ہیں شاید پڑھنے سے دلچسپی رکھتے ہوں مگر یہاں بھی وہی معاملہ تھا۔ چنانچہ ہم نے فوراً سپر ڈال دی اور پوچھا۔

''کس موضوع پر نوٹس چاہیے۔''

''غالب کی غزل گوئی پر۔''

''جی!'' ہمارا سر گھوم گیا۔

''غالب کی گجل گوئی لکھوا دیجیے سر۔'' سامنے کی بینچ پر بیٹھا ہوا لڑکا جو زیادہ تیز طرار معلوم ہوتا تھا پٹ سے بولا۔

''آپ کا نام کیا ہے۔'' ہم نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔

''ذلیل عارپ۔'' جواب ملا۔

''یہ کیا ہوتا ہے؟'' نام کا مطلب ہماری سمجھ سے بالاتر تھا۔

''جلیل عارف سر۔'' ایک لڑکی نے ہنس کر بتایا۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ جو لڑکے شروع سے اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھتے رہے ہیں اور ہائی اسکول سے اچھے نمبر لے کر پاس ہوئے ہیں اُن کی زبان اور تحریر اتنی ناقص کیوں ہے؟ اور جو لڑکے ہندی میڈیم اسکولوں سے پڑھ کر آئے ہیں اور جنھوں نے شوقیہ اردو لے رکھی ہے ان کی زبان بھی ٹھیک ہے اور تحریر بھی۔

وہ طالب علم جن کے دم سے اردو زبان زندہ ہے اور پھل پھول رہی ہے انھیں امتحان میں بہت کم نمبر ملتے ہیں اور جو لڑکے اردو کو صرف رسم الخط کی وجہ سے اردو سمجھتے ہیں، ورنہ ان کا تلفظ ہندی زبان کی طرح ہوتا ہے یہاں تک کہ ان کی تحریر میں بھی ہندی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں اور اب تو بعض لڑکے اردو کے نوٹس ہندی میں تیار کرتے ہیں وہ اردو میں امتیازی نمبر لے آتے ہیں۔

دوسرے دن سے ہم نے نوٹس لکھوانے شروع کر دیے۔

''لکھیے، غالب کے فن کی انفرادیت کا راز ان کی جدت پسندی میں پوشیدہ ہے۔''

''گالب کے پھن کی امپھرادیت کا راج ان کی زدت پسندی میں پوسیدہ ہے۔''

اُف! ہم نے سر پکڑ لیا۔

''کیا ہوا سر؟''

''کچھ نہیں، آگے لکھیے۔'' ہم نے ہتھیار ڈال دیے۔

نوٹس پورے ہونے کے بعد ایک لڑکا اٹھ کر میری طرف آیا۔

سر! ذرا اسے دیکھ لیجیے۔ اگر کہیں کوئی گلطی ہو تو کریکسن کر دیجیے گا۔

لڑکے نے نوٹ بک میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہم نے نوٹ بک کھول کر دیکھا۔

''ارے باپ رے یہ کیا ہے؟''

سر آپ نے ابھی جو کچھ لکھوایا ہے وہی کریکسن کے لیے دیا ہے تا کہ اگر کچھ چھوٹ گیا ہو یا گلت لکھا گیا ہو تو ٹھیک کر دیجیے۔

میرا سر چکرانے لگا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹنے لگا۔ لیکن ہم نے جلد ہی سنبھالا لے لیا اب تک ہم اس طرح کے کسی بھی حادثے کے لیے شعوری طور پر تیار رہنے لگے تھے۔ اس حادثے کو بھی جھیل لیا۔ ان صاحبزادے کے نوٹس کا کریکشن کرنے کے لیے کچھ ہوتا تو کرتے۔ یہاں تو ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ آخر ایک ترکیب سوجھی۔

''ایسا کرو تم پڑھتے جاؤ جہاں ضرورت ہوگی وہاں ہم درست کروا دیں گے۔'' ہم نے نوٹس کی کاپی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

نوٹ بک لے کر وہ صاحبزادے اسٹیچو کی طرح کھڑے ہو گئے۔ اب نہ نوٹس بک پر سے ان کی نظر ہٹتی ہے نہ منہ سے کچھ پھوٹتے ہیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنی تحریر کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے کچھ نظر ہی نہ آ رہا ہو۔

''کیا آپ بھی اسے نہیں پڑھ پا رہے ہیں؟'' ہم نے ذرا طنز سے پوچھا۔

''یہ بات نہیں سر، مجھے ذرا جلدی ہے۔ ایک دوست کو ٹائم دے رکھا ہے۔'' اس نے جواب دیا گویا ہم پر احسان کر رہا ہو۔

ہم نے کاپی رکھ لی۔ دو چار دن گزرنے کے بعد اُس لڑکے نے کاپی کا تقاضا کیا ہم نے اُس کی کاپی جوں کی توں لوٹاتے ہوئے کہہ دیا۔ ''آپ نے ٹھیک ہی لکھا ہے کریکشن کی کوئی ضرورت نہیں۔''

کاپی اس کے ہاتھ میں پہنچی ہی تھی کہ دوسرے لڑکوں نے اس طرح جھپٹ لی جیسے کوئی قیمتی دستاویز ہو۔ اب اللہ ہی جانے آگے کیا ہوا۔

ایک دن سیکنڈ ایئر کی ٹیوٹوریل کلاس میں ہم نے لڑکوں سے کچھ لکھنے کو کہا۔ ہم نے سوچا لکھانے سے زیادہ بہتر ہوگا کہ خود انھیں سے کچھ لکھنے کو کہا جائے۔ اس طرح وہ اپنے ڈھنگ سے لکھ سکیں گے۔ چنانچہ ہم نے کہا۔

''آج آپ لوگ مضمون ''قرآن پاک کا تاریخی اعجاز'' کا خلاصہ لکھ کر دکھایئے۔''

یہ سنتے ہی سب کے منہ لٹک گئے۔ مرے ہوئے انداز میں سب نے کاپیاں کھولیں اور کسی نہ کسی طرح لکھنا شروع کیا۔ پورا پیریڈ گزر گیا۔ گھنٹی بجنے میں چند منٹ رہے ہوں گے کہ ہم نے کاپیاں مانگ لیں۔ کوئی کاپی دکھانے کو تیار نہ تھا۔ خیر کسی طرح چند کاپیاں میز پر جمع ہو سکیں۔ وقت بالکل نہ تھا اس لیے ہم نے کاپیاں لے کر بیگ میں رکھ لیں۔ خالی پیریڈ میں ہم نے کاپیاں نکالیں ایک کاپی جس پر تحریر ذرا صاف صاف تھی اور تھوڑی سی محنت سے پڑھی جا سکتی تھی میں نے پڑھنا شروع کی۔

''شاعر سید سلیمان ندوی بہت مشہور ناول نگار گزرے ہیں۔ ان

کی نظم قرآن پاک کا تاریخی اعجاز بھی بہت مشہور نظم ہے۔ اس میں شاعر نے ہمیں قرآن کی تلاوت کرنے کو کہا ہے۔ ہر مسلمان کو تلاوت کرنا چاہیے اس سے ثواب ملتا ہے۔"

تقریباً اسی طرح کی تحریروں سے ہم اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ سید سلیمان ندوی کے ناول نگاروں کا علم ہمیں نہیں تھا۔ اور نہ ہی نظم کے اس نئے فارم کی خبر تھی۔ اس لیے اب تک ہم "قرآن پاک کا تاریخی اعجاز" کو نثر کی حیثیت سے پڑھاتے رہے تھے۔

شروع شروع میں ہمیں ان نئی معلومات سے الجھن ہوئی تھی۔ بار بار یہی سوال ذہن میں اٹھتا تھا کہ اس طرح کیسے چلے گا۔

انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے لیے فارم بھرے جانے لگے تو لڑکوں نے گیس (Guess) کی فرمائش کی۔ اپنے ہونہار طالب علموں کے لیے ہم نے بڑی محنت سے امکانی سوالات تیار کیے اور انھیں لکھوا دیے۔

امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ کئی مہینوں کے بعد نتیجہ بھی نکل آیا۔ چند ایک "کند ذہن" لڑکے جو محنتی تھے اور کلاس میں بھی اچھا کرتے تھے امتحان میں واجبی نمبروں سے پاس ہوئے تھے۔ بقیہ سبھوں نے امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی۔ ہم نے جب ان نمبروں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ان سارے لڑکوں کو جنھوں نے ہماری معلومات میں اضافے کیے تھے اور ہمیں ادیبوں اور شاعروں کی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں سے روشناس کرایا تھا اردو میں انھیں Distinctions ملا تھا۔

ہم نے لڑکوں کو مبارک باد دی تو انھوں نے خوش ہو کر بتایا "سر آپ کا گیس نیٹ نیٹ لڑ گیا تھا۔ ہم نے اسی کے مطابق "تیاریاں" کی تھیں۔

اچھا اچھا...! ہم بھی خوش ہو گئے۔ حالاں کہ یہ تیاریاں ہمیں معلوم تھیں۔ نوٹس اور گیس پیپر کے صفحے باریک تحریر کے ننھے ننھے پرزے امتحان ہال کے باہر برآمدوں اور ٹوائلیٹ کے اندر بکھرے ہوئے مل جاتے تھے۔

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ شروع شروع میں ہمیں لڑکوں کے وسیع مطالعہ اور اپنی کم مائیگی سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ بار بار یہی خیال آتا تھا کہ اس طرح کیسے چلے گا لیکن آئی اے اور پھر بی۔ اے کے ریزلٹ نے ہر وسوسہ دل سے نکال دیا۔ اب ہم کالج جاتے ہیں، کلاس میں جا کر حاضری لیتے ہیں۔ طالب علموں کو نوٹس لکھوا دیتے ہیں۔ گیس تیار کر کے لڑکوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بس اپنی ڈیوٹی ختم۔ نہ دماغ تھکتا ہے نہ جبڑے دکھتے ہیں۔ نہ زبان سوکھتی نہ گلا خشک ہوتا ہے۔ وقت سے پہلے نصاب ختم اور ریزلٹ سپر ہٹ۔

Prof. Khursheed Jahan
Dept. of Urdu
vinoba bhave university
Hazaribagh-825301 (Jharkhand)

فرہنگ آصفیہ سے

ب - ع۔ اسم مؤنث۔ (۱) عربی فارسی اردو الف بے تے کا دوسرا اور ہندی حروف صحیح کا تیسواں اور شفقی کا تیسرا حرف جسے بائے ابجد۔ بائے موحدہ۔ بائے تازی۔ اور ہندی میں بے کہتے ہیں۔ عربی والے اس کا تلفظ الف کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ (۲) حساب جمل میں اس کے دو عدد فرض کیے گئے ہیں۔ (۳) یہ حرف اردو میں فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ کبھی معیت۔ کبھی قسم کبھی صلہ و اتصال۔ کبھی صاحب اور والا کے معنوں میں بالفتح آتا ہے۔ لیکن جہاں والا کے معنی دیتا ہے وہاں الف کے ساتھ لکھتے ہیں۔ چنانچہ ترتیب وار مثالوں سے ثابت ہے۔ بدل و جان۔ بخدا۔ واللہ باللہ۔ رنگ برنگ۔ دم بدم۔ اسی موقع پر عوام نے ہندی الفاظ کے درمیان بھی اس بے کو برتا ہے جیسے گھر بگھر۔ ہاتھوں ہاتھ وغیرہ۔ باایمان۔ باوفا۔ باتمیز یعنی ایمان دار۔ وفادار۔ صاحب تمیز یہ حرف بعض اوقات حروف ذیل سے بدل جاتا ہے۔

(پ) بادشاہ۔ پادشاہ۔ بابو۔ باپو۔ کھبنا۔ کھپنا۔ بتاسا۔ پتاسا۔

(ج) بلنا۔ جلنا۔ بھلسنا۔ جھلسنا۔

(د) جب۔ جد۔ کب۔ کد

(گ) سابودانہ۔ ساگودانہ۔ ابنا۔ اگنا۔ بگولا۔ ببولا

(ل) ٹبیا۔ ٹیلا۔ ابیچنا۔ الاہجا

(م) نیب۔ نیم۔ بور۔ مول۔ نیبو۔ لیمو۔ نربدا۔ نرملا۔ بلب گڑھ۔ بلم گڑھ

(و) سیب۔ سیو۔ ابیر۔ اویر۔ بیلا۔ ویلا۔ بچ۔ وچ۔ بابا۔ باوا۔

ڈاکٹر شاہدہ صدیقی

کون بنے گا کروڑ پتی؟

پڑھا بھی ہے اور لوگوں سے سنا بھی خوب ہے کہ پرانے زمانے میں راجے مہاراجے اپنی بیٹی کو پتی سے آراستہ کرنے کے لیے طرح طرح کے سوانگ رچایا کرتے تھے۔ نئے نئے ڈھنگ اپناتے تھے، دور دراز کے علاقوں کے کنوارے بالوں کو مدعو کر کے امتحان کے پل صراط سے سب کو گزار کر ان میں سے کسی ایک کو حق شوہریت عطا فرماتے تھے۔ جیسے سیتاجی کو جیتنے کے لیے راجہ جنک نے راجکماروں کے سامنے دھنش لا کر رکھ دیا کہ اس کو توڑ دو تو سیتاجی سے رشتہ جوڑ و۔ اسی طرح قصہ چہار درویش یا حاتم طائی میں بھی شوہر پانے کے لیے بادشاہ یا خود شہزادیاں عجیب و غریب شرائط رکھا کرتی تھیں۔

لیکن اب... زمانہ بدل گیا ہے زمانہ کیا صدی تک بدل چکی ہے۔ والدین تو والدین خود لڑکیاں تک پتی سے زیادہ لکھ پتی کی تلاش میں رہتی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک لڑکی کو تو یہاں تک کہتے سنا گیا کہ میں تو اپنے پتی کو خود ہی لکھ پتی بنا دوں گی بشرطیکہ وہ کروڑ پتی ہو۔

کروڑ پتی... ہاہاہا... اس لفظ سے تو آج ہر کان آشنا نظر آتا ہے۔ عورت ہو یا مرد۔ بچہ ہو یا بزرگ اس کا شیدائی نظر آتا ہے۔

اور پھر جوانوں کا تو کہنا ہی کیا۔

اللہ بھلا کرے Star Plus اور امیتابھ بچن کا، جن کی ملی بھگت نے ہر ہندوستانی کی نظروں میں بیٹھے بٹھائے، کروڑ پتی بننے کے خواب سجا کر رکھ دیے اب تو جسے دیکھو وہی کروڑ پتی بننے کا خواہش مند۔ Star Plus میں جانے کا حاجت مند۔

اس پروگرام نے ایک ساتھ کئی لوگوں کو کئی طرح سے فائدہ پہنچایا ہے، جیسے...

نمبر ایک۔ اسٹار پلس دیکھنے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔

اسی کی وجہ سے اس چینل کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ ورنہ اس چینل پر پروگرام تو پہلے بھی آتے تھے لیکن ان پروگراموں کو دیکھنے کی اتنی خواہش کبھی نہیں ہوتی تھی کہ کھانا، مجبل چھوڑ کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر کھایا جائے۔ یا پھر ایک گھنٹے تک بھوکا رہا جائے۔

اس پروگرام نے جہاں اسٹار پلس کو سپر اسٹار بنا دیا وہیں دوسرے چینل بھی اسے مات دینے کی کوشش میں سرگرم نظر آنے لگے۔

نمبر دو یہ کہ اس چینل پر دکھائے جانے والے اشتہاروں کی وجہ سے ان کمپنیوں کو کروڑوں کا بزنس دے کر انھیں کروڑوں میں مزید کھیلنے کا موقع فراہم کیا۔

تیسری بات یہ کہ امیتابھ بچن کی کم ہوتی مقبولیت کو پھر سے بڑھا کر اسے کروڑوں کے دل کی دھڑکن بنا دیا۔

4۔ تعلیم بالغان کی گھٹتی وقعت کو پھر سے اجاگر کر دیا۔

5۔ بچوں میں کم ہوتے تعلیمی رجحان کو فروغ دیا۔

6۔ جنرل نالج کی کتابوں کی اشاعت و فروخت دونوں کو بڑھایا۔

7۔ اب تو جس دوکان پر/ اسٹال پر دیکھو جنرل نالج کی کتابیں نظر آتی ہیں یا پھر کروڑ پتی بننے کے نسخے بتانے والے رسالے۔

8۔ آج کل سفر میں لوگ گھٹیا ناولوں کے بجائے معیاری کتابیں پڑھتے پائے جاتے ہیں۔

9۔ خواتین بھی گپ شپ میں مشغول رہنے کے بجائے ''پڑوسن کانفرنسوں'' میں کروڑ پتی بننے کے طریقوں پر بحث کرتی نظر آتی ہیں۔

10۔ اور تو اور بچے تک آج کل اس پروگرام کی زبان میں باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ چاہے اسکول ہو یا گھر اسکول میں پوچھے

جانے والے سوالوں پر ٹیچر سے چار Option مانگتے ہیں تو گھر پر بھی سے۔ جیسے... ماں اگر بچے سے کھانے/ ناشتہ کے متعلق اس کی پسند جاننا چاہے تو بچہ جھٹ سے کہتا ہے پہلے چار Option تو دو۔

ماں... A میگی B۔ حلوہ پوری۔ C۔ آلو پراٹھا D۔ Pizza بچہ ...D۔ Pizza۔

ماں... Sure فائنل جواب Lock کر دیا جائے وغیرہ وغیرہ اس طرح ٹیلی ویژن پر دکھایا جانے والا یہ واحد پروگرام ہے جس نے ہر عمر کے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔

اس پروگرام کی مقبولیت نے تو رامائن، مہابھارت کی شہرت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

ہفتہ کے چار دن رات کے 9 بجے سے 10 بجے تک ہر ٹی وی والا اپنے ٹیلی ویژن سے ایسے چپکتا ہے جیسے مقناطیس سے لوہا۔

امیتابھ بچن کہیں یا نہ کہیں۔ اس کے آگے سے ہٹنا کوئی نہیں اور جن دنوں لائنیں کھلی ہوں، تب تو پوچھنا ہی کیا۔

لوگوں کی انگلیاں دن رات.. ٹیلی فون گھمانے یا پھر اس کے بٹن دبانے میں ہی مصروف رہتی ہیں۔

ہماری پڑوسن تو اس معاملے میں اتنی مستعد ہیں کہ ادھر ٹیلی ویژن پر اگلی تاریخوں کا اعلان ہوا اُدھر اگلے دن سے ہی شوہر بچے نوکر سب کو تاکید کر دی کہ ایک شہر کا نمبر معہ کوڈ کے اپنے ذہن میں بٹھانا ہے اور اگر ذہن ساتھ نہ دے تو سب کو کاغذ قلم لے کر بیٹھنا ہے تاکہ کسی بھی جگہ کا نمبر رہ نہ جائے۔ اور اس کے لیے بھی خاص ہدایت دی جاتی ہے کہ کون کس شہر کا نمبر لکھے گا۔ تاکہ سب لوگ ایک ہی جگہ کا نمبر نہ لکھ ڈالیں۔ اور باقی نمبروں سے وہ محروم رہ جائیں کیوں کہ ہر بار وہ ہر شہر کے نمبر بھی آزماتی ہیں اور جواب غلط ہونے پر دوسرے نمبر کے لیے دوسرے لوگوں کے ٹیلی فون نمبر کا استعمال بھی کر لیتی ہیں۔

اس بار بھی لائن کھلنے پر ویسا ہی سب کچھ ہوا۔

بس اتنا اضافہ اور ہوا کہ ایک اور فون شوہر کے نام کا لگوا لیا اپنی شادی سالگرہ کے تحفہ کی شکل میں شوہر سے موبائل فون جھٹک لیا اور ایک ایکسٹنشن کچن میں بھی لگوا لیا تاکہ کوئی کسر نہ رہ جائے۔ ساتھ ہی گھر کے ہر فرد کی ڈیوٹی لگا دی کہ 24 گھنٹے KBC کو کوئی نہ کوئی فون ملاتا ہے۔ کبھی تو نمبر ملے گا۔

آخر کار ان کی لگن اور تیاریاں دونوں کام آئیں۔ اور دوسری طرف سے نمسکار کے ساتھ آواز آئی۔ کون بنے گا کروڑ پتی میں آپ کا سواگت ہے۔ پڑوسن اس وقت کچن میں تھیں۔ یہ آواز سن کر ان کا چھوٹا بچہ انٹرکام پر اتنی زور سے ''ممی جلدی آؤ'' کہہ کر چلایا کہ آواز بغیر فون کے سیدھی ان تک پہنچ گئی۔ جسے سن کر وہ ایسی گھبرائیں کہ دودھ کی پتیلی کے نیچے گیس کھلی چھوڑ کر لپکیں کمرے کی طرف۔ تب تک دوسری طرف بولنے والا کمپیوٹر کافی آگے تک بول چکا تھا۔ انھیں سنائی پڑا تو بس اتنا کہ 9 نمبر دبائیں۔ کھٹ سے انھوں نے 9 پر انگلی رکھی کہ انگریزی چالو۔ جو کچھ کم آئی۔ سر کے اوپر سے زیادہ گزری۔ پھر بھی انگل سے سوال سمجھے بغیر دبا دیا ایک نمبر کہ آواز آئی یہ ہوئی نہ بات۔ بس اتنا سننا تھا کہ خوشی کے مارے کانفرنس کا بٹن کھول دیا۔ باقی کی باتیں باقی افراد خانہ نے سن کر انھیں سمجھائیں۔ تب پتہ چلا کہ اگلا فون اُدھر سے آئے گا۔ اگلے ماہ کی 10 تاریخ کو۔ یہ جان کر خوشی سے ایسی اچھلیں جیسے ہرش وردھن کے بعد بننے والی دوسری کروڑ پتی وہی ہوں۔ بس پھر کیا تھا۔ ہو گئیں تیاریاں شروع۔

کیوں کہ سب سے بڑی تو خوشی تھی امیتابھ بچن سے ملنے، اس کے روبرو بیٹھنے کی۔ جس کے لیے ڈریس، جیولری، سینڈل پرفیوم، ہیئر اسٹائل، سب کے بارے میں غور کر کے شروع کر دی خریداری۔ ساتھ ہی گھر میں اس بات پر بھی بحث چلنے لگی کہ کون ساتھ چلے گا۔ کون گھر پر رہ کر امیتابھ کے فون کا انتظار کرے گا۔

شوہر نامدار حق شوہریت کا استعمال کرتے ہوئے ہوائی جہاز کا لطف لینے اور فائیو اسٹار ہوٹل کے مزے لوٹنے کے لیے ساتھ جانے پر بضد تھے۔ اُدھر مائیکہ نواز بیوی میکے سے کسی کو ساتھ لے کر جانے پر مصر تھیں۔ اس لیے بات تو تو میں میں سے بھی آگے بڑھ گئی تو پتی پرمیشور منہ پھلا کر اخبار پڑھنے بیٹھ گئے۔ ماحول میں گرمی محسوس کر کے بچے بھی باہر کھسک لیے اور وہ اوفوہ کہہ کر اٹھیں تو کچن میں دودھ کی جلی پتیلی سے اٹھتا دھواں دیکھ کر ہائے کر کے وہیں بیٹھ گئیں۔

اگلے ماہ کی دس تاریخ تک کا وقت بڑی بے صبری سے گزرا اس دوران انھوں نے پاس پڑوس، خاندان، جان پہچان سبھی کو یہ اطلاع دے دی کہ کروڑ پتی بننے کی طرف اُن کا پہلا قدم اٹھ چکا ہے۔ اگلا مرحلہ بھی دیکھنا میں چٹکیوں میں سر کر لوں گی۔ پھر تو ہاٹ سیٹ پر بیٹھ کر ہی آپ سے ملاقات ہو گی۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی تیاری بھی جاری رکھی بازاروں کے چکر لگاتے دیکھ اپنوں نے انھیں سمجھایا، دشمنوں نے منہ بنایا، کچھ نے ہنسی اڑائی تو کچھ نے مذاق بنایا۔ بہی خواہوں نے اشاروں، کنایوں میں اس قبل از وقت تیاری کو فضول قرار دیا۔ افراد خانہ نے مہینے کی آخری تاریخوں کا حوالہ دے کر انھیں اس فضول خرچی سے باز رکھنے کی کوشش کی، جس کا

انھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور تنبیہ کو اپنے کروڑپتی بننے کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہوئے دھمکی کے طور پر اعلان کر دیا کہ اگر آپ نے مجھے اس نیک کام کو کرنے سے روکنے کی کوشش کی تو میں بینک سے Loan لے کر اپنی اس خواہش کو پورا کرلوں گی لیکن پھر جیتی ہوئی رقم سے آپ سب کو عاق کردوں گی۔ یہ دھمکی کام کر گئی اتنی کہ وہ اپنے ملنے جلنے والیوں سے اُدھار لے کر جو ول چاہا خریدتی رہیں۔ اور گھر کے لوگ تماشائی بنے رہے۔

اللہ اللہ کر کے وہ تاریخ آ ہی گئی، جس کا انتظار تھا۔ اس لیے رات کو ہی کو صبح ۴ بجے کا الارم لگا کر جلد ہی سو گئیں اور بغیر الارم کے جاگ کر باقی سوئے ہوئے لوگوں کو بھی جھنجھوڑ کر بٹھا دیا اور خود کچن میں مصروف ہو گئیں۔

سب کو تنبیہ کر دی کہ دن بھر جس کو جو کھانا ہو ابھی بتا دو 6 بجے سے پہلے جو چاہے پکا دوں گی پھر تو شام 7 بجے تک میں فون کے آگے سے نہیں ہٹوں گی۔

گھر میں گہما گہمی کا عالم تھا۔ سب ضروریات سے فارغ ہونے میں لگے تھے۔

ٹھیک چھ بجے وہ سارے کام چھوڑ کر جڑ کر بیٹھ گئیں فون سے۔ ذرا دیر بعد ہی ٹرن ٹرن کی آواز پر جھپٹ کر چونگا اٹھایا، لیکن فون کسی ملنے والی کا تھا جو معلوم کرنا چاہ رہی تھیں کہ فون آیا کہ نہیں۔ ابھی نہیں کہہ کر انھوں نے فوراً فون بند کر دیا۔ اسی طرح دن بھر کوئی نہ کوئی اس بارے میں جاننے کے لیے فون کھنکھٹاتا رہا، جس سے ان کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی۔

ایک ایک کر کے پورے ۳۱ گھنٹے گزر گئے۔ سامنے قالین پر چائے کی پیالیوں، مونگ پھلی کے چھلکوں، کھانے کی پلیٹوں کے ڈھیر لگ گئے، فون کال کی جھڑی لگ گئی لیکن...

جس کے انتظار نے ٹیلی فون کا بل بڑھایا۔
اپنے پرس اور شوہر کی جیب کو ہلکا کیا۔
قرض کا بوجھ بڑھایا۔ شرمندگی کا نوالہ بنایا
وہ نصیب دشمناں۔ انتظار جاں۔ وہ ظالم
وہ ٹیلی فون نہ آنا تھا نہ آیا۔

اور پھر کچھ دن بعد۔ آیا ٹیلی فون...کا...لمبا سا بل۔ آئے ٹیلی فون قرض خواہوں کے۔

آئے کچھ کارڈ، دشمنوں کی طرف سے مبارک باد کے۔

اور سنائی دیں کافی دن تک پڑوسیوں کی طنزیہ جملے بازیاں اور ہنسی کی آوازیں۔

Dr. Shahida Siddiqui
C-49/4, RDSO
Lucknow-226011

فرہنگ آصفیہ سے

خِضر۔ ع۔ اسم مذکر۔ یہ لفظ بکسر اول سکون دوم بالفتح اول وسکون ثانی اساتذہ فارس کے کلام میں و بکسر اول و فتح دوم بعض متاخرین فارس و اردو کے اشعار اور عوام الناس اردو ان کی بول چال میں پایا جاتا ہے۔ لیکن شعرائے اردو نے اکثر مقلد میں فارس کا تتبع کیا ہے چنانچہ ایک شعر قاآنی کا جو متاخر فارس سے ہے اور جس نے نظر اثر شجر وغیرہ پر ہائے قافیہ رکھی ہے۔ تمثیلاً اردو کے درج لغات کئے جاتے ہیں

صد مرتبہ گر دو بترازز ہر ہلاہل	گر ز آنکہ قند تکس تو درآب خضر بر	(قاآنی)
عمرِ خضر سے اس کی زیادہ ہو زندگی	دھو ڈان پیے جو یار کی زلفِ دراز کا	(آتش)
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر	نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کیلئے	(عارف)
ملے گر عمر بھر ہمکو گزاریں بادہ خواری میں	خضر کی طرح کیوں پھر پھر کے ہستی رائیگاں کیجئے	(عارف)

(۱) ایک پیغمبر کا نام جن کا معجزہ یہ تھا کہ جہاں بیٹھتے وہاں سبزہ نمودار ہو جاتا جس جگہ سے گزر جاتے وہ جگہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتی چنانچہ اسی وجہ سے یہ لقب پڑ گیا کیونکہ خضر بمعنی سبز و سبزہ کلام عرب میں آتا ہے۔ ایشیائی لوگ ان کو دریا اور صحرا کا پیغمبر مانتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سکندر کو آب حیات تک یہی لے گئے تھے۔ جس کے پینے سے ان کو عمر جاوداں نصیب ہوئی مگر سکندر محروم رہا۔

بستی بستی کا جال

بانو سرتاج

شہر کے آخری سرے پر بنے مکان میں جب وہ شفٹ ہوئی تو دور دور تک آبادی کے آثار نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑا کہ وہ بھیڑ میں شامل رہ کر بھی تنہا چلنے کی عادی ہو چکی ہے۔ لیکن یگانی شادی میں دیوانے عبداللہ جیسے لوگوں کو چین کہاں؟ پوچھتے ''آپ کو ڈر نہیں لگتا؟ کتنا اندھیرا ہے یہاں؟''۔

وہ دل میں کہتی ''اپنے اندر چھپے ہوئے اندھیروں سے جو مانوس ہیں، باہر کا اندھیرا اُن کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ ڈر اندر ہوتا ہے۔ دل میں، خیالوں میں، آنکھوں میں، پورے جسم میں۔ باہر تو فقط عکس ہوتا ہے...'' بظاہر جواب دیتی... ''مجبوری ہے، اپنا مکان آخر اپنا ہوتا ہے۔ دیکھنا، سال دو سال میں یہاں کیسے بستی بستی ہے''۔

اماں بھی بولیں ''کہاں ویرانے میں جا بسے ہو تم لوگ''۔

نئے مکان میں پہلا کام جو اس نے ہاتھ میں لیا وہ اپنے کتب خانے کو سنوارنے کا تھا۔ دوسرا سامان کھولا تک نہیں۔ کھانے کا ڈبہ دونوں وقت اماں بھیج دیتیں۔

چوکیدار کی آٹھ سالہ بیٹی تجسس سے اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک دن دیکھا، دو دن دیکھا... کتابوں کے بکسے کھل رہے ہیں اور کوئی سامان نہیں... بے تاب ہو کر پوچھ بیٹھی ''تمہارے گھر میں برتن نہیں ہیں؟''۔

اس نے ہنس کر کہا ''نہیں ہیں، میں کتابیں ہی کھاتی ہوں''۔

دماغ کی غذا، کتابیں ہی ہوتی ہیں۔ روح کی بھوک مطالعہ ہی سے تسکین پاتی ہے۔ اسے کھانے کو نہ ملے، کتابیں مل جائیں بس... وہ اس کی ہمدم، ہمراز ہیں۔ صحیح معنوں میں حیات کی شریک۔ زندگی کی ساتھی۔

ایک رات موسلا دھار بارش ہوئی۔ سویرے اٹھ کر دیکھا۔ گیٹ کے سامنے تالاب بن گیا تھا۔ بچپن یاد آ گیا۔ ناؤ بنا کر پانی میں چھوڑنے کی خواہش ہوئی۔

تنہا ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے۔ چھوٹی بڑی سب خواہشیں پوری کر لو۔ کوئی دیکھنے والا نہیں۔ کوئی ٹوکنے والا نہیں... نہ مضحکہ اڑانے والا کوئی۔

وہ کاغذ موڑ موڑ کر کھولتی رہی کاغذ نے ناؤ کی شکل اختیار نہیں کی۔ اف خدا!۔ وہ ناؤ بنانا بھول گئی تھی۔ بہت دنوں سے بنائی نہیں تھا نا!! ایسی غفلت اس سے کیوں کر ہوئی؟ اپنی محرومی اپنے درد کو وہ اسی لیے جب تب تازہ کرتی رہتی ہے کہ کہیں محرومی کا احساس فنا نہ ہو جائے۔ درد مٹ کر لا دوا نہ بن جائے۔ تنہائی اس سے چھن گئی تو اس کا وجود بھی تو نہیں رہے گا۔

وہ کوشش کرتی رہی... کرتی رہی۔ آخر کاغذ نے ناؤ کی شکل اختیار کر لی۔ اُتھلے پانی میں پاؤں جماتی وہ گہرے پانی کی طرف چلی۔ دیکھتے دیکھتے ایک لمبا سانپ سامنے سے گذر گیا۔ ناؤ پانی میں تیرا کر اس نے چوکیدار کو آواز دی۔ سانپ کے بارے میں بتایا۔ وہ بولا ''موسم کی پہلی برسات ہے، بلوں میں پانی بھر گیا ہے۔ اب دیکھنا بائی، سانپ بچھو کیسے اُبلتے ہیں''۔

شام کو چوکیدار نے دیکھا، وہ سینڈلیں ہاتھ میں لیے، ساڑی اونچی کیے، چھپ چھپ کرتی ہوئی تالاب کے اُس پاس جا رہی ہے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ تعریفی انداز میں بولا ''آپ بڑی دلیر ہیں۔ سویرے ہی تو اتنا بڑا سانپ دیکھا تھا''۔

وہ زیرِ لب مسکرا کر رہ گئی۔ ہنہ! سانپ سے کیا ڈرنا؟ چوکیدار کیا جانے کہ سانپوں سے اس کا کتنا قریبی رشتہ ہے۔ کوئی چیز حرکت کرے، اندیشہ ہوتا، سانپ ہے۔ بیٹھے بٹھائے چلتے چلاتے محسوس ہوتا سرر... رر سے سانپ نکل گیا۔ کوئی رات ایسی نہیں جاتی جب خواب میں دو چار سانپ نظر نہ آتے ہوں۔ وہ نفسیات کی طالبہ رہ چکی ہے۔ اس نے بار ہا ان

وجوہ کو ڈھونڈنے کی سعی کی ہے جو اس خوف کی جڑ میں ہیں۔ اپنی محرومی، تنہائی اور درد کے پس منظر میں اس کامپلکس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ نتائج واضح اور مثبت ہونے پر بھی ان کی نفی کرنے میں اسے خوشی ہوتی ہے۔ وہ تصور کرتی ہے... گویا وہ ناگ لوک سے جلاوطن کی گئی کنیا ہے۔ اسی لیے اس دنیا کے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی ہے۔ اپنے آس پاس عالم خواب میں، عالم بیداری میں سانپوں کی موجودگی محسوس کرتی ہے۔ شعوری، غیر شعوری طور پر اپنے کو ان میں سے ایک سمجھتی ہے...

"چوکیدار! مجھے ناگ ناگن کا جوڑا دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ یہاں کہیں تمھیں دیکھنے کا اتفاق ہو تو مجھے بھی ضرور دکھانا"۔ وہ چوکیدار سے کہتی ہے۔

"ناگ، جوڑا دھامن کے ساتھ بناتا ہے ناگن کے ساتھ نہیں"۔ چوکیدار نے کہا" آپ پڑھے لکھے لوگ مانتے نہیں، میں آپ کو دکھاؤں گا تب تو یقین کریں گی"۔

اس نے چوکیدار کی بات کی تردید نہیں کی۔ وہ خیالوں میں کھو چکی تھی۔

وہ جو اپنے کو ناگ کنیا سمجھتی ہے تو کیا غلط ہے؟ اس کا ناگ کسی دھامن کے ساتھ مگن رہتا ہے اور وہ بے اعتنائی کے جزیرے میں تنہائی کا عذاب جھیلتی رہتی ہے۔

پڑوس میں تعمیر کے آثار نظر آئے تو اسے اچھا نہیں لگا... تھوڑا اطمینان بھی ہوا۔ اچھا اس لیے نہیں لگا کہ تنہائی میں خلل پڑ رہا تھا۔ لوگ سناٹے سے گھبراتے ہیں، اسے خاموشی عزیز ہے... کیوں کہ خاموشی ہی میں وہ اپنے اندر کی آواز سن سکتی ہے... اطمینان یوں ہوا کہ بھلائی چاہنے والوں سے کہہ سکے گی... "دیکھیے بستی بس رہی ہے"۔

مکان کی بنیاد رکھی جانے لگی تو جنگل میں منگل ہو گیا۔ رنگین ساڑیاں لہرانے لگیں۔ مردوں کے قہقہے گونجنے لگے، بچوں کی کلکاریاں سنائی دینے لگیں۔ ٹرکوں، ٹریکٹروں کا شور ہونے لگا... اس نے سوچا، میری نئی کہانی کے کردار یہی ہوں گے۔ یہ میرے آرام میں خلل انداز ہونے والے، میری تنہائی کو بھیڑ میں بدلنے والے...

ان میں سے کوئی نہ کوئی یقیناً اس سے اپنی کہانی لکھوانے میں کامیاب ہو جائے گا، ورنہ آج کل ہوتا یہ ہے کہ وہ قلم ہاتھ میں لیتی ہے۔ ایک دو سطور لکھتی ہے کہ مختلف خیالات یلغار کر دیتے ہیں۔ مجھے فوقیت دو۔ مجھے کاغذ پر اتارو ورنہ میں آؤٹ ڈیٹڈ ہو جاؤں گی... ہو جاؤں گا، کبھی کبھی تو کوئی بے باک خیال صاف کہہ دیتا ہے... تمہاری زندگی ختم ہو جائے اس سے پہلے مجھے زندگی دے دو۔ اس وقت وہ واقعی سہم جاتی ہے۔ اف! اگر ایسا ہو گیا تو؟ روح کو غذا فراہم کرنے والی کتابیں، روح کے جسدِ خاکی سے نکل جانے کے بعد کیا خالی پنجر کے تئیں انسانوں کی طرح اپنا فرض نبھا سکیں گی؟... مٹی کو مٹی میں ملا سکیں گی؟ یا بے جان کتابوں کے درمیان وہ اس وقت تک لاوارث پڑی رہے گی جب تک برسات کے سبب پانی بھر جانے سے ناگ، بل کے باہر نہ آ جائے گا؟۔

خوف سے نجات پانے کے لیے وہ خود کو کرداروں کی تلاش میں گم کر دیتی ہے۔ نظر شیونتی پر رک جاتی ہے۔ وہ اپنے شیر خوار بچے کو لے کر کام پر آتی ہے... اس کے کمپاؤنڈ کی دیوار اور ببول کے درخت کی شاخ کے درمیان جھولا باندھ کر بچے کو جھولے میں ڈال کر کام میں لگ جاتی ہے۔ گھنٹے گھنٹے میں دودھ پلاتی ہے۔ کبھی گھنٹے سے بھی پہلے، جب دودھ کا بوجھ گھمیلا اٹھانے میں مانع ہو جاتا ہے۔ ٹھیکیدار اسے کاہلی، کام چوری پر محمول کر کے گالیاں دیتا ہے... 'حرام خور' کے سوا مخاطب نہیں کرتا... اس وقت شیونتی کی آنکھوں میں جو بے بسی دکھائی دیتی ہے اس پر کہانی تو کیا مکمل ناول لکھا جا سکتا ہے۔ وہ کہانی کا تانا بانا بننے لگتی ہے... جو ماں ہے وہ لاچار ہے... جو ماں نہیں ہے وہ بھی دُکھ بھوگ رہی ہے۔

شیونتی شاید بے بس ماتا کو زبان دینے میں کامیاب ہو جاتی اگر مادھو اور اس کی بیوی سامنے نہ آ جاتے۔ مادھو بیاہ کر کے آیا تو اس نے اس کی بیوی کو گھریلو کام کرنے کے لیے بلایا۔ مادھو بولا "میری گھر والی میرے گھر کی رانی بن کے رہے گی۔ دوسروں کے گھر کی خادمہ نہیں بنے گی۔ اُجلی رنگت ہے... باہر نکلنے سے جل جائے گی"۔

غرور کب کس کو راس آیا ہے؟ ایک بیٹے کی آس میں چھ بیٹیاں پیدا کر چکنے کے بعد اُجلا رنگ خواب کی بات ہو گیا۔ صحت مند جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تو نکلی کام پر۔ اب چار اینٹیں لے کر چلتی تو ڈگمگاتی تھی... ناخواندگی... جہالت، ضعیف الاعتقادی کے ناگوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے لکھی ہوگی کوئی جلتی ہوئی تحریر!

اس نے قلم اٹھایا تھا کہ کجی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ نو دس برس کی یہ معصوم لڑکی اسکولی یونیفارم پہنے رامی، بچلوا، شگن اور بملا کے بچوں کے ساتھ تمام دن ریت کے ڈھیر پر کھیلتی رہتی ہے۔ اس کے پاس کپڑوں کا یہی ایک جوڑا ہے... اسکول کھلنے تک تو روزانہ پہننے سے پھٹ جائے گا۔ اس نے فوراً ایک جوڑا خرید کر اسے دے دیا "اسکول کا ڈریس اسکول میں پہننا۔ روزانہ پہن کر خراب نہ کرو"۔

وہ حیرت سے بولی "اسکول کا ڈریس!! یہ تو ایک بائی نے دیا ہے۔ میں اسکول نہیں جاتی"۔ کچھ رک کر طفلانہ شوق سے وہ بولی "مگر مجھے اسکول جانا اچھا لگتا ہے"۔

جو جس چیز کی خواہش کرے وہ اسے مل ہی جائے یہ ضروری تو نہیں ہے؟۔ مگر حقوق تو سب کو اپنے اپنے ملنے ہی چاہئیں۔ وہ اپنے حق کو روتی بیٹھی ہے۔ تجی کو اپنے حقوق کا علم ہی نہیں۔ اسکول جانے کی عمر والی لڑکیوں کو اسکول نہ جانے دینا ظلم ہے، ناانصافی ہے۔ یہ اسے اسی وقت معلوم ہوگا جب وہ علم حاصل کرے گی... اسے آواز اٹھانا ہے تجی کے لیے ... معاملہ چھوٹی عدالت کا ہے... نپٹ جائے گا۔ اس کا معاملہ سب سے بڑی عدالت کا ہے جہاں یک طرفہ فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاملے میں بے بس ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے رونے میں دوسروں کو فراموش کر جائے۔ اسکول جانے کی عمر میں ریت کے ڈھیر پر کھیلنے والے کل مزدوری کریں گے، ہوٹلوں میں برتن دھوئیں گے، کارخانوں میں موٹریں صاف کریں گے مگر اسکول نہیں جاسکیں گے۔ یہ ایک یونیورسل پرابلم، عالمی مسئلہ بن گیا ہے۔ اسے وقت کی آواز میں آواز ملانا ہوگی...

وہ لکھنا چاہتی ہے مگر لکھ نہیں پاتی... لاجونتی، جس کا پتی اسے روز شراب پی کر مارتا ہے، جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے پر بھی اسے مزدوری کے لیے بھیجتا ہے، اس سے اپنی کہانی لکھنے کی درخواست کرتی ہے۔ شنکر مستری کہتا ہے، میری بہن کی زندگی برباد کرکے چھاتی پھلائے گھومنے والے ٹھیکیدار کو بے نقاب کرو۔ پنڈت رام آسرے، فسادات کا شکار اپنے خاندان والوں سے جدائی کا داغ دنیا والوں کو دکھانے پر زور دیتا ہے۔

وہ لکھ نہیں پاتی ہے۔ شیونتی، تجی، مادھو، رامی، ہکلو او غیرہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے گڈمڈ ہونے لگتے ہیں — پڑوس میں مکان بن کر تیار ہو جاتا ہے، مگر کہانی مکمل نہیں ہو پاتی ہے۔ نہ ہو۔ کوئی بات نہیں۔ مکان تو بنتے ہی رہیں گے... کبھی نہ کبھی تو اسے ایسا کردار ملے گا جو اس سے اپنی کہانی لکھوائے گا۔

بستی تیزی سے بسنے لگی ہے... تنہائی، قصے کہانی کی چیز بن گئی ہے اسی لیے وہ اپنے اندر بہت عرصے سے نہیں جھانک سکی۔ ایک جال وہ اپنے ہی گرد بنتی رہی تھی، جس میں مکڑی کی طرح قید ہوگئی ہے۔ جیسے جیسے بستی بس رہی ہے وہ اُجڑتی جارہی ہے، خود کہانی بنتی جارہی ہے۔

●●●

Bano Sartaj
Sartaj House
Opposite: Akashvani
Civil Lines
Chandrpur-442401- (M.S)

فرہنگ آصفیہ سے

فراموشن ۔(انگلش فری میسن) Freemason کا بگڑا ہوا لفظ ۔ اسم مذکر۔ ایک قدیمی اور خفیہ مجلس ۔ ایک خاص عقیدے کے لوگوں کا فرقہ۔ یہ لفظ فری بمعنی آزاد میسن بمعنی راج ۔ معمار یا سنگتراش سے مرکب ہے جس کی نسبت اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ اول میں معماروں کا ایک فرقہ جس کا اتحاد اور ایکا مشہور تھا۔ اس نام سے مشہور ہوا۔ بعد میں اسی بنا پر ایک فرقہ نکلا جو مجلسی خوشی باہمی اتحاد اور ہمدردی کا دم بھرتا اور سب سے جدا عقیدہ رکھتا ہے۔ ان لوگوں نے آپس میں اس قسم کی علامتیں اور اشارے مقرر کر رکھے ہیں جس کی وجہ سے ایک دوسرے کو پہچان لیتا اور اس کے ساتھ نہایت ہمدردی سے پیش آتا ہے اور نیز انہوں نے اپنی مجلس میں شریک کرنے کے واسطے فیس اور خاص خاص قاعدے مقرر کر رکھے ہیں جنہیں ظاہر کرنے کی نہایت ممانعت اور ان کا اظہار نقض عہد میں داخل ہے۔ ایک صاحب جو خاص فری میسن ہیں اس طرح لکھتے ہیں کہ اس جماعت کہ اصلیت دنیا کے شروع زمانے سے قرار دی جاتی ہے مگر اس کی مضبوط اور باطریقہ بنیاد حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام کے زمانے سے قائم ہوئی۔ حضرت ممدوح نے مقام یروشلم یعنی بیت المقدس میں ایک معبد بنایا تھا جس کی صناعی لاثانی اور بے نظیر ہے۔ انہوں نے دور دراز مقامات سے بھی اچھے اچھے کاریگر اس مقام کے لئے بلوائے تھے چونکہ یہ خدا کا کام تھا اس سبب سے حضرت سلیمان کی یہ خواہش بھی ہوئی۔ یہ جو کاریگر اس کام میں مصروف ہیں ان کے اخلاق چلن اور افعال کو بھی برگزیدہ آفاق ہونا چاہئے چنانچہ ان کاریگروں کی ایک جماعت قائم ہوئی۔ جو شخص جس قابل تھا وہ اس درجہ میں رکھا گیا۔ ان کو پند و نصائح سے اور زیادہ تر کاریگری کے آلات اور کاموں کے ذریعہ سے دنیا کے اچھے کام سکھائے گئے اور میسری کے اصول بند رویج بنائے گئے۔ عبادت گاہ کے ختم ہونے پر کاریگر اپنے اپنے وطن کو واپس جانے والے تھے اس وقت ان کو ہدایت کی گئی کہ جو باتیں انہوں نے سیکھی ہیں ان کو بطور راز کے رکھیں اور خاص خاص لوگوں پر ظاہر کرکے جابجا جماعتیں قائم کریں۔ یہ جماعت اس وقت سے چلی آتی ہے اسی وجہ سے اس فرقہ کے ممبر میسن کہلاتے ہیں جس کے معنی معمار ہیں۔ جادو وغیرہ کا ان پر اتہام ہے۔ اردو والے اس مجلس کے ہر ایک ممبر پر یہی لفظ بولتے ہیں اور انہوں نے اس کا اطلاق ہر رنگ پر صحبت ہر مشرب اور ہمراز شخص پر جو کسی اوباش وضع یا شراب خوار ٹولی کا آدمی ہو کر رکھا ہے۔

پیا ملن کی آس

نفیس بانو شمع

وحیدن بائی اکثر سکندر جان کے سامنے اپنے ماضی کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتیں۔

"تو مجھے تو چودہ سال کی عمر میں میری ماں ہیرا بائی نے مجرے پر بٹھا دیا تھا۔" پھر دونوں کان چھو کر کہتیں، اور گھنگرو تو استاد قربان علی نے سات برس کی عمر میں ہی پیروں میں بندھوا دیے تھے۔ دس گیارہ کی ہوتے ہوتے میں استاد قربان علی کی تعلیم میں طبلے کی تھاپ پر فروٹ ہو چکی تھی۔

یوں تو میں خاندانی طوائف زادی تھی مگر میری ماں ہیرا بائی نے اپنی آخری عمر تک یہی کوشش کی کہ میں اپنے عاشقوں میں سے کسی ایک کا ہاتھ تھام کر گھر بسا لوں۔ مگر میں نامراد نواب مرشد آباد کی محبت میں جتلا رہی۔

"اماں کیا نواب مرشد آباد نے آپ کو نہیں اپنایا؟" سکندر جان نے بھولپن سے پوچھا۔

"بیٹی طوائف کا مقدر تو کوٹھے سے بندھا ہوتا ہے۔" وحیدن نے ایک سرد آہ کھینچی اور یہ شعر پڑھا :

میں تماشہ گہہ عالم کا گلہ کس سے کروں
میں تو وہ تھی جسے ملبوس نے عریاں رکھا

وحیدن بائی اپنے وقت کی چھمَّن چھری تھیں۔ اپنے عالم شباب میں انھوں نے گوالیر کے درجنوں سیٹھوں اور صاحب ثروت شرفاء کو بھکاری بنا دیا ـــــ اپنے زمانے میں انھوں نے لاکھوں کمائے اور سیروں سونا تن پر لادا۔ کہتے ہیں کہ رنگ وروپ کی ذرا سانولی تھیں مگر ناک نقشے میں تیکھی اور غضب کی بانکی تھیں۔ گلے میں کوئل کی کوک تھی۔ نواب مرشد آباد کہتے ہیں کہ وحیدہ جان کی گائیکی مجھے میری بیس کوس دور والی بارہ دری سے بھی اپنے کوٹھے پر کھینچ لاتی ہے ـــــ اپنے زمانے کے اچھے اچھے رئیس زادے اور نواب وحیدن بائی کی مجرا محفل میں بیٹھ کر وحیدن بائی کے ہاتھ سے گلوری بیڑہ کھانا اپنی خوش نصیبی گردانتے تھے۔ مگر، جب ان کے شباب کا سورج ڈھلنے لگا تو سب سے پہلے نواب مرشد آباد نے ترک تعلق کا زخم دیا۔ جو وہ برداشت نہ کر سکیں۔ انھوں نے گوالیر ہی چھوڑ دیا جو ان کا آبائی وطن بھی تھا۔ اور ـــــ محبت کے سجدوں سے بھرا، ایک ایسا چمن جس کی خوشبو وہ اپنے ساتھ "نخاس چوک" کے کوٹھے تک لے آئی تھیں ـــ!

سکندر جان وحیدن بائی کی اپنی بیٹی نہ تھی۔ ہاں مگر جس روز سے اس کے قدم کوٹھے پر پڑے اس نے وحیدن کو اماں کہا ـــــ سکندر جان کا اصلی نام عشرت جہاں تھا۔ اس کے والد شہامت حسین نظام تھیٹر میں گیٹ کیپر تھے۔ بائسکوپ کا دور آ چکا تھا۔ گھر گھر میں ناچتی گاتی بولتی تصویروں کے چرچے تھے۔ فلموں کے پردے پر بھی گانے بجانے والیوں اور ڈیرے کوٹھے والیوں کا راج تھا۔ ہاں شریف گھرانوں کی کچھ ایکٹرسیں آئی ضرور تھیں مگر گنتی کی۔ ناٹک کمپنیوں پر بہار تھی۔ شہر کے نظام تھیٹر میں ہفتے کے دن فلمیں دکھائی جاتیں اور باقی تین دنوں میں بڑی بڑی کمپنیاں اپنے ڈرامے کھیلتیں۔ سکندر جان کے والد شہامت حسین ڈراموں کے بے حد شوقین تھے۔ وہ جب پانچ چھ برس کی تھی تب ہی سے اپنے ساتھ تھیٹر ہال پر لے جانے لگے۔ اور عشرت جہاں کو فلموں سے زیادہ ڈراموں کا چسکہ لگ گیا۔ زندہ ناچ گانے اور راجہ مہاراجہ، شہزادے، شہزادیوں کی محبت کے ڈراموں کی دیوانی ہو گئی ـــ

اور عشرت جہاں شاید اس دور کی پہلی شریف زادی تھی جسے ناٹک کی چمک دمک، ستاروں والے کپڑے پہن کر ایکٹریس بننے کے شوق نے گھر سے بھگایا۔

ہال میں چائے بسکٹ اور کولڈ ڈرنک سپلائی کرنے والے ایک لڑکے سلیم سے اس کی دوستی ہو گئی ـــ آخر ایک دن عشرت جہاں نے اپنے دل کی بات سلیم سے کہہ دی ـــ

"سلیم میں بھی سلمہ ستارے والے مخمل کے کپڑے پہن کر اور ہیرے موتیوں والا تاج لگا کر شہزادی اور ملکۂ عالم بننا چاہتی ہوں ـ" وہ ہنسا پھر بولا ـــ

"مگر وہ تاج تو نقلی ہیرے موتیوں کا ہوتا ہے۔ گوٹہ کناری بھی جھوٹے ہوتے ہیں"۔

"ہونے دو مگر مجھے ناٹک میں کام ضرور کرنا ہے ـ"

"مگر اس کے لیے تو تمھیں کلکتہ یا بمبئی جانا ہوگا۔ سب بڑی تھیٹر کمپنیوں کے سیٹھ وہیں رہتے ہیں۔ یہاں تو بس کمپنی والے اپنا کھیل دکھانے آتے ہیں۔"

"تو کیا ہوا میں جاؤں گی نا کلکتہ، بمبئی ـــ"

"اکیلی!"

"اکیلی کیوں تم چلنا میرے ساتھ۔"

"کیا!" اس نے حیرت اور خوف بھرے انداز میں عشرت جہاں

کو دیکھا۔ پھر پوچھا تھا۔ ''تمھارے ابا راضی ہو جائیں گے؟''۔

''ارے پاگل انھیں بتائیں گے کب۔ کھال نہیں اُدھیڑ دیں گے۔ بس تھوڑے روپے پیسے لے کر بھاگ نکلیں گے۔ پھر جب میں بہت مشہور ایکٹریس بن جاؤں گی تو واپس آ کر معافی مانگ لیں گے۔'' سلیم کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا پھر بولا تھا۔

''دیکھو عشرت میری سوتیلی ماں دلبر پہلے ناٹک کمپنی میں کام کرتی تھی جہاں سے سات آٹھ برس پہلے میرا باپ اسے بھگا کر لایا ہے۔ میں اس سے بات کروں گا وہ سب ناٹک کمپنی والوں کو جانتی ہے۔''

سلیم کی بات سن کر آنکھوں میں خواب ستارے بن گئے ـــــ

عشرت جہاں سلیم کے ساتھ جب اس کے گھر گئی تو دلبر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایسی واری صدقے ہوئی جیسے عشرت پیدا ہی ناٹک کمپنی میں ہیروئن بننے کے لیے ہوئی ہو۔

اور ایک دن اسکول جاتے ہوئے عشرت جہاں نے ماں کے زیور اور کچھ روپے صندوق سے نکالے اور سلیم کی ماں کے پاس پہنچ گئی۔ دلبر اُسی رات اسے لے کر بھوپال کے لیے روانہ ہوگئی ـــ اٹارسی، جھانسی، بنارس اور پھر لکھنؤ تیرہ چودہ برس کی عشرت جہاں نے دلبر کٹنی کی سرپرستی کے 12 دن میں تجربات کی ایک صدی طے کر لی۔

پھر وقت کے بے رحم ہاتھوں نے عشرت جہاں کو دلبر کٹنی کے چنگل سے نکال کر وحیدن بائی کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس میں شک نہیں کہ وحیدن بائی دلبر کٹنی کی طرح خود غرض اور ظالم نہیں تھی۔ ہاں تھوڑی دیر تک عشرت جہاں کی بڈی بوٹی کا جائزہ ضرور لیا۔ جیسے قصائی ذبح کرنے سے پہلے بکرے پر نظر ڈالتا ہے۔

کچھ دیر تک انھوں نے سرگوشی میں باتیں کیں پھر شہ نشین سے اپنی ہاتھی دانت کی صندوقچی اتار کر لائیں اس میں سے روپوں کی ایک تھیلی نکال کر دلبر کو تھما دی۔ اس کے بعد گھنگروؤں والی چاندی کی نازک سی پازیب اس کے خوبصورت پیروں میں پہناتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔

''نام کیا ہے تمھارا؟''

وہ اپنا نام بتانے والی ہی تھی کہ وحیدن مسکرا کر بولیں ـــ ''نام تو ہم رکھیں گے بٹیا کا کیوں دلبر! سکندر جان کیسا رہے گا؟''

دلبر پوری مکاری سے بولی تھی ''اے میں صدقے میں قربان کیا نام رکھا ہے آپ نے میں تو کہوں مقدر کی سکندر بن کر راج کرے گی آپ کے یہاں ـــ''

سونے چاندی کے کھنکتے ماحول اور وحیدن بائی کی محبتوں کے ریشمی سائے میں سکندر جان کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی۔ ہاتھوں میں ہلکے پھلکے زیور اور ناک میں سونے کی نتھ پہنا دی گئی۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کے گھر آنگن میں نتھ کا مول اور وقعت کیا ہوتی ہے ـــ

وحیدن کو مہینے دو مہینے میں ہی اندازہ ہو گیا کہ سکندر جان کی اٹھان غضب کی ہے۔ رقص کرتے پیروں کی ایک ایک جنبش پر اس کے بدن میں سو سو بھنور پڑتے تھے۔ وحیدن بائی قربان ہوئی جاتیں ـــ

''نخاس چوک'' کی کئی نامور گانے والیوں کے کوٹھے ویران ہوگئے۔ سکندر جان کے مجروں کی وہ دھوم مچی کہ لکھنؤ کا ہر رئیس زادہ سکندر جان پر مرنے مٹنے چلا آتا ـــ

بس انھیں دنوں میں سکندر جان کو ایک نیا چسکا لگ گیا۔ مجرے اور تعلیم سے وقت ملتا تو کتابیں پڑھنے میں گزارتی۔ پہلی بار پتہ نہیں وہ کتاب کہاں سے ہاتھ لگی تھی۔ ''آفتاب عالم'' اس کتاب کا نام تھا جس میں ہمارے نبی ﷺ کی سیرت پاک درج تھی۔ اس دن کے بعد سے سیرت نبوی کی بہت ساری کتابیں سکندر جان کے مطالعہ میں آئیں۔ اس کے بعد تصوف کی ''داتا گنج بخش''، ''کیمیائے سعادت''، ''کشف المحجوب'' جب مقصدِ حیات کا راز کھولنے لگیں تو وہ اب مجرے کے لیے ٹال مٹول کرنے لگی۔

اب ہر جمعرات کو شاہ مینا کے آستانے پر حاضری اس کا معمول بن گیا ـــ وہ اکثر تنہائی میں خود سے باتیں کرتی ـــ

''میرے خالق نے جب لفظ ''کن'' کہہ کر اس کائنات کو اپنے نور سے روشنی بخشی ہوگی تو اس منور کائنات میں شاید میں ہی بدنصیب سیاہ حرف بن کر ابھری ہوں گی ـــ ایسا حرف جو آج تک اپنی تقدیر کا دامن گیر ہے۔ سوچتی ہوں سب کچھ چھوڑ کر صحرا میں نکل جاؤں مگر اماں وحیدن کی بے پناہ محبت میرے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔

کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں ایسا سیاہ نقطہ ہوں جو مسلسل ایک محدود دائرے میں اپنے بے معنی سفر پر رواں دواں ہے۔ اور کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ اگر پوری وسعتِ کونین مجھے مل جائے تو میرے لیے تنگ ہوگی ـــ نہ جانے میرے اندر کا قیدی پرندہ اپنی پرواز کے لیے کیسی بلندیاں چاہتا ہے؟

سکندر جان کے اندر کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ راستے ہموار تھے ـــ لیکن منزل یوں ہی تو نہیں مل جاتی ـــ

وہ رات بھی عجیب تھی ـــ سکندر جان عالمِ اضطراب میں کوٹھے کی پچھلی طرف والے کمرے میں کھڑی تھی۔ رات کا دوسرا پہر ہوگا۔ موسم سرما کی آمد آمد تھی۔ اس نے دریچے کی پوری چق ہٹا کر بند ہوتے ہوئے بازار

پرنظر ڈالی ـــ قمر انصاری نے اپنا چائے کا ہوٹل بند کر دیا تھا۔ نصرو بھٹیارا اپنی کلیجہ نہاری کی دکان بند کر کے چلا گیا تھا۔ بس عبداللہ حلوائی کی دکان پر رات کا آخری شو دیکھ کر یا کسی کوٹھے سے مجرا سن کر آنے والے پانچ سات دودھ پینے والے کھڑے تھے ـــــ کوٹھے کے پچھواڑے کھڑکی کے عین سیدھ میں لکڑی کی ٹال تھی۔ اس کے بائیں طرف بالکل سڑک کے کنارے چھوٹے سے ٹین شیڈ کے ملگجے اندھیرے سے اچانک ایک بلند آواز ابھری۔

''جانے والے، او بھائی بیڑی جلا دے، او بھائی بیڑی جلا دے۔ ارے سؤر بیڑی جلا دے۔

آواز کیا تھی ـــ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی گونجتی چیخ ہو ـــ صبح سکندر جان نے وحیدن بائی سے رات والی آواز کا ذکر چھیڑا تو وہ ہنس کر بولیں ـــ

''تو نے آج سنا ہے وہ تو سات مہینے سے ٹین شیڈ کے نیچے پڑے ہیں۔

''مگر ہیں کون؟''

''بھئی زیادہ تو مجھے بھی نہیں معلوم یہ چائے خانے کے مالک قمر انصاری اس روز بتا رہے تھے کہ حافظ قدیر نام ہے اُن کا سہارنپور کے کسی دیندار گھرانے سے تعلق ہے ـــ دری چادروں کی گانٹھیں لے کر لکھنؤ آتے تھے ـــ قدم بہک گئے۔ ''نخاس چوک'' کی ایک طوائف پر عاشق ہو گئے۔ ایک روز مجرا سن کر عبداللہ حلوائی کی دکان پر دودھ پینے گئے تو اسی ٹال والے ٹین کے نیچے کوئی مادرزاد برہنہ فقیر رات کو ''بیڑی جلا دے، بیڑی جلا دے'' کی آواز لگایا کرتا تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات اسی ٹین کے نیچے ننگا پڑا رہتا۔ اس رات حافظ قدیر کو جانے کیا سوجھی کہ اس فقیر کے لیے میٹھے دودھ کا ایک گلاس لے کر پہنچ گئے۔ فقیر نے آدھا گلاس دودھ پیا اور آدھا حافظ قدیر کو پلا دیا۔ بس اُس رات سے آج تک حافظ قدیر اسی ٹین کے نیچے ننگے پڑے رہتے ہیں لیکن اُس فقیر کو اس رات کے بعد کسی نے آج تک نہیں دیکھا ـــ

کھاتے پیتے کہاں سے ہیں؟ سکندر جان نے پوچھا۔

صبح اٹھتے ہی اس فقیر کا چھوڑا ہوا کاسہ اٹھا کر گلی گلی گھومتے ہیں جو مل جاتا ہے کھا پی لیتے ہیں۔ دن بھر سوتے ہیں۔ اور آدھی رات سے بیڑی جلا دے، کی رٹ لگاتے ہیں۔

سکندر جان کو یہ کہانی عجیب سی لگی۔ وہ شام کو شاہ مینا صاحبؒ میں حاضری دیتی تھی۔ اور ہر جمعرات کو حلوہ بنا کر لے جاتی اور وہاں تقسیم کرتی ـــ خدا جانے اس روز سکندر جان کے جی میں کیا آئی اس رات کو جب حافظ قدیر بیڑی جلا دے، کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس نے چینی کی بڑی سی قاب میں حلوہ بھرا اور ان کے پاس ٹین کے شیڈ میں پہنچ گئی۔ وہ سر سے پاؤں تک برہنہ تھے بس ٹانگوں پر میلا سا کمبل پڑا تھا۔ وہ ان کے بالکل نزدیک بیٹھ کر بولی۔

''چیختے چلاتے کیوں ہیں، لیجیے حلوہ کھایئے۔''

وہ اپنی انگارہ جیسی آنکھوں سے اسے گھورنے لگے۔ ''کھایئے نا ـــ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''راکھ مت کریدا اندر چنگاریاں دبی ہیں۔''

پہلے تو اسے لگا کہ وہ اپنا قالب میں پتھر ہو جائے گی، پھر ایک دم موسم بدلا، نئے موسم کی آمد پر جیسے پرندے اپنا رُخ بدل لیتے ہیں ـــــ بس اسی طرح الف ننگا وجود بھی سکندر جان کے سامنے کسی لمحہ جاوداں کی مانند رُخ پھیرے بیٹھا تھا۔ پھر یکا یک مڑا اور اس کے ہاتھ سے حلوے کی قاب لے کر غڑپ غڑپ کر کے چند لقمے حلق سے اتارے۔ پھر انھیں گندے میلے ہاتھوں میں حلوہ بھر کے سکندر جان کی طرف بڑھا کر بولے تو نے کھایا؟ لے کھا لے۔'' وہ ایک دم گنگ سی انھیں دیکھ رہی تھی۔

انھوں نے اس بار یوں کہا کہ لہجے میں نہ غصہ تھا نہ پیار۔ ''چل کھا۔''

ان کے حکم میں جانے کیا طلسم تھا کہ وہ انکار نہ کر سکی۔ اُن کی ہتھیلی پر رکھا ہوا سارا حلوہ کھا گئی۔ اس کے بعد پھر...

سب سے پہلے اسے مولوی عبدالباری نے دیکھا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ ٹال کے سامنے سے گزرے تو دیکھا سکندر جان اپنے آپ سے بے نیاز اسی ٹین شیڈ کے نیچے خاک پر ایک دم برہنہ پڑی ہے۔ مولوی صاحب نے پہلے تو استغفار پڑھی پھر اپنے کندھے پر سے سوزنی اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔

گلابی جاڑوں کی یہ صبح نخاس والوں کے لیے حیران کن تھی۔ نیم برہنہ سکندر جان ہاتھ میں کاسہ لیے قمر انصاری کے چائے خانے پر پہنچی تو ایک لمحہ کے لیے قمر انصاری کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر اس نے ایک کپ چائے اور کچھ بسکٹ کاسے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تو اب حافظ جی کی گدڑی تم سنبھالو گی؟'' وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔ پھر اسی دن کی رات میں نخاس والوں نے ایک نئی آواز سنی ـــ

''بیڑی جلا دے، او جانے والے بیڑی جلا دے ارے او سؤر ـــ''

ٹال کے سامنے والے کوٹھے کی کھڑکی پر کھڑی وحیدن بائی آواز کو سن کر ٹین شیڈ کے اندھیرے میں جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر۔ یہاں۔ قطرے کا دریا میں فنا ہونا ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی ـــ !!

Nafees Bano Shama
Post Box 9334, Jamia Nagar
New Delhi-110025

احساس نایاب

شبنم کی تپش

شبنم۔۔۔ یہ نام کتنا خوبصورت ہے، بالکل شبنم کی بوند کی طرح نرم و نازک، پاک و شفاف، جو ہوا کے جھونکے سے بھی کھل کھلا اٹھتی ہے۔ سورج کی نرم کرنوں میں ڈوب کر اور بھی پاکیزہ لگتی ہے، جسے دیکھ سکون ملتا ہے، تازگی محسوس ہوتی ہے، جسکی پاکیزگی اور خوبصورتی کی مثالیں بڑے بڑے شاعروں نے اپنے اشعار کے ذریعہ پیش کی ہیں تو کئی عاشقوں نے اپنی معشوقہ کی تعریف میں استعمال کیے ہیں۔ جب ان شبنم کے بوندوں کو دیکھتی ہوں یا شاعر اور عاشقوں کی زبانی تعریف سنتی ہوں تو خوشی سے جھومنے لگتی ہوں خود پر اترانے لگتی ہوں ایک ایک لفظ دل کو چھونے لگتے ہیں۔ کچھ پل کے لیے خود کو بھی اس شبنم کی بوند کے مانند تصور کرنے لگتی ہوں۔۔۔

جو میں نہیں ہوں۔۔ ہاں میں نہیں ہوں، میں تو شبنم کی بوندوں کا برعکس ہوں وہ جتنی پاک شفاف ہیں میں اتنی ہی ناپاک، انہیں دیکھ کر جو خوشی جو تازگی محسوس کرتے ہیں وہی مجھے دیکھ کر اتنی ہی نفرت کرتے ہیں۔ کہنے کو تو میں بھی شبنم ہی ہوں کیونکہ میرا نام شبنم ہے، شاید میرے ماں باپ نے بھی بڑے پیار اور ارمانوں سے یہ نام رکھا تھا پر آج میں بدنصیب اپنا گھر پریوار سب کچھ کھو کر وقت اور حالات کی ماری بدنام گلی کی بدنام شبنم بنکے رہ گئی ہوں جسکی دنیا رات کی تاریکی میں پروان چڑھتی اور صبح کے آغاز میں ویران ہوجاتی ہے۔ میں بدنصیب ہر رات دلہن کی طرح سجتی ہوں، کاجل، بندیا، ہونٹوں پہ لالی لگا کر ماتھے پہ بندی سجا کر کانوں میں آتھمکے، پاؤں میں پائل پہن کر بالوں میں گجرے باندھے، اپنے بدن کو خوشبو سے مہکا کر اندھیری راتوں میں جگمگاتی ہوئی گلیوں اور چوراہوں پر اپنی ہی بربادی کا نظارہ اپنے ہی آنکھوں سے دیکھنے کے انتظار میں دلہن سی سجی دھجی خود کی ہی لاش کو خود پہ لادے کھڑی رہتی ہوں تا کہ کوئی گاہک آ کر میری مجبوری کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کرے۔۔۔

اسی طرح ہر رات نہ جانے کتنوں کی سیج سجاتے ہوئے انکی راتیں رنگین کرتی ہوں اور ہر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بن بیاہی دلہن سی سفید لباس پہن اُجڑی قسمت اُجڑے ہوئے وجود کے ساتھ ودھوا جیسی لگتی ہوں۔ پر اس ودھوا کے لیے بھی کوئی آنسو نہیں بہاتا نہ ہی کوئی ہمدردی دکھاتا ہے بلکہ اس کے حصے میں تو گالیاں، لوگوں کی دھتکار اور نفرت ہے۔ اس شبنم کو کتنے ناموں سے نوازا جاتا ہے کبھی طوائف کبھی ویشیہ۔ کال گرل، بازارو نہ جانے کتنے نام شبنم کے حصے میں آتے ہیں۔ دنیا بھر کے مرد شبنم کے جسم کے دیوانے ہیں۔۔ بڑی سے بڑی قیمت دیکر شبنم کو حاصل کرنا چاہتے ہیں پر کوئی شبنم کو اپنانا نہیں چاہتا۔ زمانے سے چھپ کر شبنم سے قربت کی چاہ تو سبھی کو ہے پر دن کے اجالے میں کوئی شبنم کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔۔ مجھ جیسی اور نہ جانے کتنی ہی شبنم اسی حال میں ہیں کوئی مجبوری میں کوئی جبراً زور زبردستی مار پیٹ کر اس دلدل میں ڈھکیلی گئی ہیں اسکا اندازہ شاید ہی کوئی لگا سکے۔۔ کیونکہ یہ سلسلہ آج کا نہیں یہ تو صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔۔ جہاں شبنم جیسی بدنصیب لڑکیوں کو ہر رات عیاشی کے لئے کبھی محفلوں کی زینت بننا پڑتا ہے۔ کسی نہ کسی کے ہوس کا شکار بننا پڑتا ہے اور یہ ہوس کے غلام شکاری زمانے بھر میں سفید پوش عزت دار بنے گھوم رہے ہیں۔ اور رات کی آغوش میں اپنے کریہہ چہرہ کے ساتھ شبنم کو جنگلی کتوں کی طرح نوچتے ہیں اس کے جسم سے کھیلتے ہیں۔ اس دوران پل بھر کے لئے بھی یہ نہیں سوچتے کے یہ کسی کی بیٹی کسی کی بہن

بھی ہو سکتی ہے۔ایک جیتی جاگتی انسان ہے جو اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے اس دلدل میں پھنسی ہوگی۔۔۔ ہر گز نہیں! ان سفید پوش عیاشوں کو تو شبنم کے جسم سے مطلب ہے جس پہ گدھ کی طرح نظریں جمائے ہوتے ہیں۔۔ کسی کی مجبوری بے بسی لاچاری تو کسی عزت دار کی عیاشیاں۔۔ یہاں گنہگار کون ہے؟ ۔ مجبور، کمزور، بے بس، لاچار شبنم یا دولت کے غرور میں چور عیاش سفید پوش؟؟؟؟

پھر بھی ہمیشہ سے بدنام تو میں ہی ہوں شبنم، کوئی یہ نہیں جانتا اس بے باک سجی دھجی ہونٹوں پہ مسکان سجائے شبنم کی روح بھی ہر رات تڑپتی ہے جسم کراہ اٹھتا ہے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی سانپ شبنم کے بدن پر رینگ رہا ہے۔۔ کیڑے مکوڑے بچھو نوچ رہے ہیں میرے ارمانوں میرے خوابوں کا جنازہ اٹھ رہا ہے، اس وقت شبنم زندہ لاش سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں رہتی۔۔۔ ایک حقیقی لاش اور شبنم کی لاش میں بس اتنا ہی فرق ہے، حقیقی لاش کی سانسیں نہیں چلتی، نہ ہی اسکو بھوک پیاس لگتی ہے اور نہ ہی اسے درد کا احساس ہوتا ہے۔۔۔ پر شبنم جیسی زندہ لاشیں جنکی سانسیں چل رہی ہوتی ہیں جنھیں بھوک پیاس لگتی ہے اور انہیں درد محسوس ہوتا ہے۔۔۔ لیکن ان کے درد کی کسی کو کیا پرواہ انکے تکلیف سے کسی کا کیا لینا دینا، کیونکہ شبنم تو انسان ہے ہی نہیں، اسلئے شبنم سے ہمدردی یا مدد کرنے کی بات تو دور کی ہے شبنم کے بارے میں سوچنے بات کرنے سے بھی عزت دار انسان کتراتے ہیں یہ سوچ کر کہ کہیں ان کی زبان نہ میلی ہو جائے، ہمدردی بھری نظروں سے دیکھنے سے کہیں ان کی نظریں نہ ناپاک ہو جائیں۔۔۔ کوئی شبنم کو اس دلدل سے نکالنے کے لئے آگے نہیں آتا اور جو میرے بارے میں تھوڑی بہت ہمدردی رکھتا ہے وہ بھی مجھے ہی گنہگار ٹھہراتا ہے، جس طرح سے کل کسی بزرگ نے مجھ سے کہا جب میں چوراہے پہ کھڑی معمول کی طرح کسی گاہک انتظار کر رہی تھی اس وقت ایسا لگا کوئی مجھے بہت دیر سے دیکھ رہا ہے، جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ ایک بزرگ بابا تھے جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے پر بدنامی کے ڈر سے یا ہچکچاہٹ کی وجہ سے کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے۔ پھیکی مسکراہٹ لیے میں ان بزرگ کے کچھ پاس جا کھڑی ہوئی جیسے ہی میں ان کے قریب پہنچی وہ گھبرا کر دور ہٹ گئے جیسے میں کوئی بھوت یا اچھوت ہوں یا کسی بیماری کا شکار ہوں جو انہیں لگ جائے گی۔ لیکن مجھے ان کا یہ رویہ عجیب نہیں لگا کیونکہ یہ سب کچھ تو میرے لیے معمول ہے۔۔۔ وہ ہچکچاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے اور نرم لہجہ روز کا مجھے بیٹا کہا ان کے زبان سے خود کے لیے بیٹا سنتے ہی میری روح تک سرشاری کی لہر دوڑ گئی میں کچھ دیر کے لیے اپنے تمام دکھ درد بھول گئی زندگی میں پہلی بار کو ایسا لگا جیسے میں بھی ایک انسان ہوں۔ میری آنکھیں بھر آئیں اور میں بڑے ادب کے ساتھ بابا کی طرف متوجہ ہوئی پھر بزرگ بابا نے میری کیفیت کو بھانپتے ہوئے نہایت شفیق لہجے میں کہا بیٹا! تم یہ کام کیوں کرتی ہو یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ جس سے اللہ بہت ناراض ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد قبر میں عذاب ملے گا سانپ، بچھو کاٹیں گے اور جہنم کی کبھی نہ بجھنے والی آگ میں جلایا جائے گا تم یہ سب چھوڑ دو اتنا کہہ کر بزرگ وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا جو نہ جانے کب سے رکتا پڑا تھا اور جو بابا کی ہمدردی پا کر پھٹ پڑا۔ میں وہیں سڑک کے کنارے دھپ سے بیٹھ گئی، میں اس وقت زور زور سے چیخنا چاہ رہی تھی چلا کر بابا کو بلانا چاہ رہی تھی، اپنی بدنصیبی کی داستان آج ساری دنیا کو سنانا چاہ رہی تھی کہ میں یہ سب جان بوجھ کر نہیں کرتی، میں بھی اس دلدل سے نکلنا چاہتی ہوں۔ عزت کی زندگی جینا چاہتی ہوں، تا عمر کسی کی باندی بن کر اس کی پناہ میں رہنا چاہتی ہوں۔ میری زندگی مرنے کے بعد نہیں بلکہ جیتے جی لاش ہے، ہر رات کی سیج میرے لئے کسی قبر سے کم نہیں ہے سانپ، بچھو اس کے جسم کو اب بھی نوچتے ہیں۔ وہ اب بھی ہر دن ہر رات جسم فروشی کی آگ میں زندہ جل رہی ہے۔۔۔ شبنم آج بیدرد سماج کے ساتھ ساتھ قدرت سے بھی پوچھنا چاہ رہی ہے، آخر اسکو یہ کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔۔۔ غربت، مجبوری، بے بسی، لاچاری یا بدنصیبی کی؟؟؟

Ehsas Nayab
C/o. Mohammed Asif
S/o Mohammad Ghaus
K.R Puram ext.
Near Ram Temple
Shimoga-577202 (Karnatak)

فرہنگ آصفیہ سے

بارہ ٹوپی۔ اسم مؤنث۔ (۱) یورپ کی بارہ قوموں اور ان کی طاقت سے مراد ہے۔ شاید مختلف وضع کی ٹوپیاں دیکھ کر یہ خیال جما لیا ہے۔ (۲) بارہ عقلمند اور چالاک آدمیوں کی کونسل۔ جو دہلی کے قلعہ معلی میں بڑے بھائی مدبر اور زمانہ شناس مانے جاتے تھے۔ مثلاً مرزا ہدایت افزا۔ عرف مرزا الٰہی بخش مرحوم۔ مونس الدولہ۔ نواب فاضل بیگ خاں صاحب مغفور۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب۔ منشی تراب علی۔ نواب نبی بخش خاں۔ شیخ برکت اللہ۔ محبوب علی خاں۔ خواجہ سرا۔ مرزا جام بیگ۔ حافظ داؤد۔ اور راجہ دنیا ناتھ وغیرہ۔

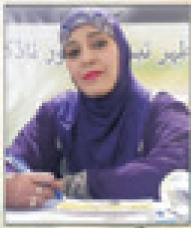

سیدہ تبسم منظور ناڈکر

زباں پہ درد بھری داستاں چلی آئی

عصر کی نماز ادا کر کے مجھے اپنی سہیلی کے گھر جانا تھا۔ گھر سے باہر نکلی تو ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سہیلی کے گھر پہنچتے پہنچتے ایسا محسوس ہونے لگا کہ شام رات کی آغوش میں جانے کے لیے بے تاب ہوگئی ہے۔ سہیلی کے گھر پہنچ کر سب سے پہلے مغرب کی نماز ادا کی اور ہم دونوں سہیلیاں باتوں میں مشغول ہوگئیں۔ چائے ناشتہ کر کے میں نے اپنی سہیلی سے کہا، ''چلو رخسار! ذرا باہر چہل قدمی کر کے آتے ہیں۔'' اس نے بھی فوراً حامی بھر لی اور ہم باہر نکل آئے۔ رات ہر طرف اپنا پہرا لگانے لگی تھی مگر افق سے ابھرتا چودھویں کا چاند ہر طرف اپنا نور بکھیرنے لگا تھا۔ جس جگہ ہم چہل قدمی کر رہے تھے اس کے عین سامنے سڑک کے اس پار ایک خوبصورت اور عالیشان درگاہ بنی ہوئی تھی۔ درگاہ سے مسجد جڑی ہوئی تھی اور اس کے باہر بڑا سا صحن بھی تھا۔ صحن میں بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں مرد، عورتیں، بچے سب شامل تھے۔ بچے کھیل کود میں مصروف تھے اور مائیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ لوگ درگاہ کے اندر جا رہے تھے اور باہر نکل رہے تھے۔ میری نظریں اسی طرف لگی ہوئی تھیں اور میں ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی۔ اچانک میری نظر گیٹ کے باہر کھڑے ایک ضعیف آدمی پر پڑی۔ سفید داڑھی، نورانی چہرہ والا وہ آدمی سفید رنگ کا کرتہ پائجامہ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ان کے لباس اور چہرے کی وجاہت بتا رہی تھی کہ وہ کسی اچھے خاندان سے ہیں۔ وہ ہر آنے جانے والے سے کچھ کہہ رہے تھے پر کوئی بھی ان کے پاس نہیں رک رہا تھا۔ بس لوگ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوئی مانگنے والے ہوں اس لیے لوگ ان کی باتوں کو ان سنی کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں دور کھڑی تھی اس لیے ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ مجھے بڑا تجسس ہوا مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگوں سے کیا کہہ رہے ہیں۔

مجھے مسلسل اس طرف دیکھتے دیکھ میری سہیلی بولی، ''شمع! آپ مسلسل اس طرف کیوں دیکھے جا رہی ہیں؟'' ''کچھ نہیں رخسار۔ آپ گھر جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں!'' ''جی اچھا۔ آپ جلدی آجانا۔'' کہتے ہوئے رخسار چلی گئی۔ میں روڈ کراس کر کے درگاہ کے گیٹ تک جا پہنچی اور ان بابا کے قریب کھڑی ہوگئی۔ مجھے بڑا تجسس ہو رہا تھا کہ آخر وہ کہہ کیا رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ان کے آنسو رخساروں سے ہوتے ہوئے ان کی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ ان کے چہرے کی وجاہت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ وہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پتہ نہیں کون سی بات مجھے ان کی طرف کھینچے لے گئی۔

''اللہ کے واسطے میری مدد کرو۔ میری بیٹی کو کینسر ہے۔ میری بیٹی کے علاج کے لیے میری مدد کرو۔ رحم کرو مجھ پر۔ کوئی تو سنو! کوئی تو رکو! میرے اللہ! میری مدد فرما۔''

میں نے یہ جملے بابا کے منہ سے سنے تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ ہر آنے جانے والا ان کی آواز سن رہا تھا پر کوئی بھی ان کے پاس نہیں رک رہا تھا۔ جن کو سننا ہی نہ ہو تو وہ کسی کی چیخ و پکار بھی نہیں سن سکتے۔ کئی لوگ مزار پر چڑھانے کے لئے پھولوں کی چادر، نذرانہ لے کر جا رہے تھے لیکن افسوس ایک زندہ، بے بس، لاچار انسان کی چیخ اور بہتے ہوئے آنسو کسی کو بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں ان کے قریب جا پہنچی اور بولی، ''بابا! لیجیے آپ تھوڑا پانی پی لیجیے۔'' انھوں نے میرے ہاتھ سے پانی کی بوتل ایسے لی جیسے وہ بہت دیر سے پیاسے ہوں اور پانی کی تلاش میں ہوں۔ انہوں

نے پانی پیا، رب کا شکر ادا کیا اور مجھے جزاک اللہ کہہ کر پانی کی بوتل واپس کر دی۔ میں نے پوچھا، "بابا! آپ کچھ کھائیں گے؟" انہوں نے تشکرانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ پاس میں ہی دو کانیں تھیں۔ میں جا کر وہاں سے ان کے لیے کچھ کھانے کی چیزیں لے آئی۔ میرے ہاتھوں سے چیزیں لے کر وہ پاس ہی ایک جگہ بیٹھ گئے۔ جب انہوں نے کھا کر پانی پی کر رب کا شکر ادا کیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتی ہوں۔ انہوں نے کہا، "جی بیٹی پوچھو۔"

"بابا آپ مجھے بتایئے کہ آپ یہاں ایسے کیوں مانگ رہے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ اللہ اور رسول پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ آپ کو یقین ہے کہ دینے والی ذات تو صرف وہی ہے۔ یہ انسان کسی کو کیا دے سکتے ہیں۔ آپ کی بیٹی کہاں ہے؟ آپ کوئی مانگنے والے یا فقیر تو نہیں لگتے! پھر کیا وجہ ہے؟ رہی علاج کی بات تو کئی ایسے ہسپتال ہیں جہاں پر کم داموں میں یا کہیں کہیں تو مفت میں بھی غریبوں کے علاج کئے جاتے ہیں۔"

بابا نے ایک لمبی سانس لی اور بولے، "بیٹی! سچ کہتی ہو۔ میں ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور میں باہر سے اس شہر میں اپنی بیٹی کے علاج کے لیے آیا ہوں۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ اس کی شادی ہونے کے تین سال کے اندر ہی اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے ننھے سے بیٹے کو لے کر اپنے ماں باپ کے گھر آ کر رہنے لگی۔ اس کی ماں یعنی میری بیوی اپنی بیٹی کو روزانہ گھٹ گھٹ کر جیتے ہوئے نہیں دیکھ سکیں۔ وہ اپنی بیٹی کے دکھ برداشت نہیں کر پائیں اور بیٹی کا دکھ سینے میں لیے اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ جیسے تیسے ہم باپ بیٹی اس بچے کو لے کر جی رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دکھوں کو یہیں ختم نہیں کیا۔ اچانک میری بیٹی بیمار رہنے لگی۔ جب بہت دنوں تک علاج کے بعد بھی صحت یاب نہ ہو سکی تو میں نے ایک بڑے ڈاکٹر کو بتایا۔ بہت سارے ٹیسٹ کرنے پر پتہ چلا کہ وہ کینسر کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ میرے پاس جو جمع پونجی تھی وہ وہاں پر اس کے علاج میں لگا دی۔ فائدہ نہیں ہوا تو جیسے تیسے بیٹی کو اپنے ساتھ اس شہر میں علاج کے لیے لے آیا۔ میری بیٹی کا علاج تو ہو رہا ہے لیکن میرے نواسے کی ضرورتیں، ہمارا کھانا پینا وغیرہ بڑے خرچ ہیں۔ کبھی کچھ ڈاکٹر دوائیاں وغیرہ بھی باہر سے لکھ دیتے ہیں۔ اس کے لیے تو پیسوں کی ضرورت ہے نا! یہ سب میں کہاں سے لاؤں۔ ان بوڑھی لاچار ہڈیوں میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ کہیں کام کر سکوں۔ اس طرح مانگنے میں بہت شرمندگی محسوس ہوتی ہے پر کیا کروں بالکل مجبور ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنے رب سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ جس حال میں رکھے میں راضی ہوں۔ بس اپنی بیٹی کی دوائیوں اور نواسے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ شام میں ایسی ہی کسی جگہ مانگنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہوں۔"

بابا کی درد بھری داستان سن کر بہت دکھ ہوا۔ اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور جتنا تھا سب نکال کر بابا کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ اتنے میں موذن کی صدائیں چہار جانب گونجنے لگیں۔ بابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھا، دعائیں دیں اور مسجد کی طرف چل پڑے۔ میں سوچتی رہ گئی کہ وقت کیا ہے؟ انسان کو کہاں سے لا کر کہاں لا کھڑا کرتا ہے۔

Syeda Tabassum Manzoor Nadkar
226/1807 Road No. 6
Motilal Nagar No. 1
Goregaon-400104 (W)Mumbai

Subscription Form "Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'خواتین دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر........................ بتاریخ........................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔ خواتین دنیا ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں۔

نام:..

پتہ:..

دستخط

حسنِ سخن

کشور آرا شبنم

غزل

جب سے تری نظر کے گرویدہ ہو گئے ہیں
ہم دل کی وادیوں میں پوشیدہ ہو گئے ہیں

سلجھا لیں آؤ مل کر وہ مسئلے جنوں کے
دوری سے جو تمھاری پیچیدہ ہو گئے ہیں

آتی نہیں لبوں پر بھولے سے بھی ہنسی اب
تم سے بچھڑ کے کتنے رنجیدہ ہو گئے ہیں

بے چینیوں سے میری ہر شے لرز اٹھی ہے
جھونکے ہواؤں کے بھی لرزیدہ ہو گئے ہیں

جب سے جنوں کو ہم نے رہبر بنا لیا ہے
پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو گئے ہیں

رونے پہ تیرے شبنم گل ہنس رہے ہیں لیکن
یہ کیا کہ تا بہ داماں نمدیدہ ہو گئے ہیں

Kishwar Saifuddin Khan
Rampur, (U.P)

سیدہ شانِ معراج

غزل

وسعتِ صحرا سے چھوٹے بام و در میں آ گئے
صبح کے بچھڑے مسافر شام گھر میں آ گئے

اوّل اوّل بے کراں تھیں آسمان کی وسعتیں
فاصلے پھر خود سمٹ کر بال و پر میں آ گئے

دل میں پوشیدہ رہے وہ رازِ سر بستہ مگر
بے سلیقہ چند آنسو چشمِ تر میں آ گئے

رفتہ رفتہ رنگ لائے میرے سجدوں کے نشاں
عکس سارے پھر ابھر کر سنگِ در میں آ گئے

شاعری کا فن، ادا جینے کی، اور آدابِ غم
یہ ہنر بھی شانؔ دستِ بے ہنر میں آ گئے

Syeda Shane Meraj
Train Tikli
Shahjahanpur-242001 (U.P)

ثمینہ مشتاق

نئی اڑان

یوں لگتا ہے جیسے تجھ کو جانتی ہوں میں برسوں سے
پیاری چڑیا یہ تو بتا دے تیرا میرا ناطہ کیا

کیا تو بھی اپنوں سے بچھڑ کر ہجر کے صدمے سہتی ہے
تجھ کو بھی لگتا ہے یہ گھر ہے ان دیکھا انجانہ کیا

جانتی ہوں کہ تیری کہانی کچھ کچھ میرے جیسی ہے
میری طرح فرقت سے بھرا ہے تیرا بھی افسانہ کیا

تجھ کو بھی کیا اپنے چمن کی یاد پریشاں کرتی ہے
تو نے بھی سپنوں کی خاطر چھوڑا ٹھور ٹھکانہ کیا

ایک سی ہے دونوں کی زباں اور ایک سے ہیں دونوں کے دکھ
یہ مایا آنی جانی ہے کیا کھونا اور پانا کیا

نئی ہے منزل نئی اڑانیں کیوں نہ ہو پھر سوچ نئی
ماضی تھا جو بیت گیا اب اس پر اشک بہانا کیا

ہم خوابوں کے پنکھ لگا کر نئے ترانے گائیں گے
عزم و ارادہ پختہ ہو تو مشکل سے گھبرانا کیا

Sameena Mushtaq
Kainat Residency Flat No. 102
Ratho Layout, Anant Nagar
Near Noori Masjid
Nagpur-440015 (M.S)

عمرانہ خانم

غزل

تو نے تو بے شمار ستم ہم پہ ڈھائے ہیں
ہم ہیں کہ پھر بھی تیری قسم مسکرائے ہیں

دو چار گام آپ مرے ساتھ کیا چلے
دنیا نے بے حساب فسانے بنائے ہیں

کل میں نے جس کی راہ میں کلیاں بچھائی تھیں
آج اُس نے میری راہ میں کانٹے بچھائے ہیں

نفرت کے دیپ چاہے جلایا کرے کوئی
ہم نے سدا چراغِ تعصب بجھائے ہیں

افسوس باغباں نے اُجالے کے واسطے
عمرانہ جانے کتنے نشیمن جلائے ہیں

Imrana Khanam
C/o. Jamshed Khan
H.No382, Ist Floor Gali.No. 17,
Near Medicos, Zakir Nagar,
Jamia Nagar, New Delhi-110025

مینا نقوی

غزل

دل سے ترے خیال کو اس طرح کم کیا گیا
ہجر کی آنچیں پڑھیں پلکوں کو نم کیا گیا

آنکھوں سے خواب چھین کر وقت نے جب کیا ستم
آئینہ روبرو کیا عکس کو ضم کیا گیا

سارے جہاں کی رنجشیں اہلِ جہاں کو ہم سے تھیں
لمحے خوشی کے چھین کر ہم پہ ستم کیا گیا

اس کی عطا سے ہی کھلے پھول ہمارے عزم کے
کانٹے بچھا کے راہ میں جود و کرم کیا گیا

نہرِ فرات عشق کی خشک ہوئی جفاؤں سے
حشر بپا وفاؤں کا زیرِ علم کیا گیا

چہروں کا نور چھن گیا آنکھوں سے روشنی گئی
رشتوں کو جب سے راہیِ ملکِ عدم کیا گیا

میری کتابِ زیست کے روشن تھے باب اس لئے
صفحۂ لہو کئے گئے لفظ قلم کیا گیا

یونہی نہیں ملا ہمیں دنیا کو جیتنے کا فن
ہاتھوں کو جوڑ کر رکھا سر کو بھی خم کیا گیا

یوں بھی ہمارا "حالِ دل" مینا کیا گیا بحال
پڑھ کے دعا یقین کی سینے پہ دم کیا گیا

نظم

دوستوں کی طرح

غم زدہ وقت کی پھر آنکھ سے ٹپکا آنسو
آج پھر دیکھا محبت کا اندھیرا منظر
ہر طرف بکھرا ہوا دیکھا لہو جذبوں کا
آج پھر درد کا بڑھتا ہوا دیکھا تیور

رشتۂ دل میں کیوں شبنم کی نہیں ہے ٹھنڈک
ہر تعلق میں کیوں ایک آگ چھپی رہتی ہے
بدگمانی کا زہر دل میں اترتا کیوں ہے
شعلے بجھ جاتے ہیں چنگاری دبی رہتی ہے

دل کی دھڑکن میں عجب کرب کا سناٹا ہے
ہر نفس درد کی آہٹ سے سہم جاتا ہے
ہم نشیں ہو کے بھی سمجھا نہیں اس نے مجھ کو
غم وفا کا یہ میری روح میں جم جاتا ہے

اپنا ملنا تو مقدر میں نہیں تھا لیکن
راہ میں ملنے کے کچھ موڑ تو پڑ سکتے تھے
آنکھ میں اشک لئے لب پہ تبسم لے کر
دوستوں کی طرح ہم لوگ بچھڑ سکتے تھے

Dr.Meena Naqvi
A 301 Mahamaya Balika Inter College
Staff Campus
Sector 44
Noida- 201301 (UP)

عزیز بانو داراب وفا

غزلیں

ہٹا کے میز سے اِک روز آئینہ میں نے
پھر اپنے آپ سے رکھا نہ واسطہ میں نے

جب اپنے آپ سے، پہچان اپنی کھو کے ملی
تو خود ہی کاٹ دیا اپنا راستہ میں نے

میں کمسنی میں بھی گڑیاں کبھی نہیں کھیلی
پلوں میں طے کیا برسوں کا فاصلہ میں نے

چراغ ہوں مجھے جب دھوپ راس آ نہ سکی
تو خود سکوڑ لیا اپنا دائرہ میں نے

میں اپنے آپ میں ہوں یا نہیں، کبھی اپنا
کسی کو ٹھیک بتایا نہیں پتہ میں نے

عجیب کیا جو بکھیرا انہیں سمیٹ کے پھر
تمام عمر امیدوں کا سلسلہ میں نے

پڑا ہے زندگی کے اُس سفر سے سابقہ اپنا
جہاں چلتا ہے اپنے ساتھ خالی راستہ اپنا

کسی دریا کی صورت بہہ رہی ہوں اپنے اندر میں
مرا ساحل بڑھاتا جا رہا ہے فاصلہ اپنا

لٹا کے اپنا چہرہ تک رہی ہوں اپنا منہ، جیسے
کوئی پاگل الٹ کے دیکھتا ہو آئینہ اپنا

یہ بستی لوگ کہتے ہیں مرے خوابوں کی بستی ہے
گنوا بیٹھی ہوں میں بد قسمتی سے حافظہ اپنا

گئے موسم میں میں نے کیوں نہ کاٹی فصل خوابوں کی
میں اب جاگی ہوں جب پھل کھو چکے ہیں ذائقہ اپنا

فسانہ در فسانہ پھر رہی ہے زندگی، جب سے
کسی نے لکھ دیا ہے طاقِ نسیاں پر پتہ اپنا

لذیذ پکوان

مزیدار کاجو کتلی بنانے کی ترکیب

ترکیب: 1۔ کاجو، لوفیٹ ملک پاؤڈر اور الائچی پاؤڈر کو اچھی طرح مکس کرلیں۔

2۔ ایک بڑے پتیلے میں پانی گرم کریں کہ پانی میں جوش آتا رہے اب اس پتیلے میں ایک چھوٹا اسٹیل کا برتن رکھیں (اس طریقے کو ڈبل بوائلر کہتے ہیں)

3۔ اس چھوٹے برتن میں کاجو اور ملک پاؤڈر ڈال دیں۔

4۔ اب اس میں براؤن شوگر ڈالیں اور تھوڑی تھوڑی مقدار میں آئسنگ شوگر اور پانی ڈالتے جائیں۔

5۔ تیزی سے چمچہ ہلاتے رہیں اور آخر میں عرق گلاب ڈال دیں۔

6۔ اس وقت تک چمچہ چلائیں جب تک کہ تمام اشیا مل کر ایک پیڑے کی شکل میں نہ آجائیں۔

7۔ اب ہاتھوں پر ہلکا سا تیل لگا کر اس پیڑے کو ہلکے ہاتھوں سے گوندھیں تا کہ پیڑہ ملائم ہو جائے پھر ویکس پیپر پر ڈال کر بیلن سے ایک انچ موٹا بیل لیں۔ اور ڈائمنڈ شیپ میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔

8۔ کاجو کتلی کے ٹکڑوں کو آدھے گھنٹے کے لئے فریج میں رکھیں تاکہ شیپ سیٹ ہو جائے۔ پھر روم ٹمپریچر میں رکھ کر سرو کریں۔

پانی کا ذائقہ وافادیت بڑھانے کی 5 آسان تراکیب

1۔ انگور اور کینو سے بنا فلیورڈ پانی کے اجزا

انگور کے بڑے دانے۔ پندرہ عدد، کینو کی پھانکیں پندرہ عدد، پانی ایک لیٹر

ترکیب: انگور کے دانوں کو بیچ میں سے آدھا کرلیں۔ کینو کی پھانکوں میں سے بیج نکال کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ ایک لیٹر پانی میں انگور اور کینو کے ٹکڑوں کو ڈال کر تیس منٹ کے لئے چھوڑ دیں۔

فوائد: اس پانی میں موجود انگور گرمی کی شدت کو کم کرتا ہے اور اگر جسم میں پانی کی کمی کے باعث پلیٹلیٹس کم ہو جائیں تو تیزی سے بڑھاتا ہے۔ کینو وٹامن سی اور اینٹی آکسیڈنٹ سے بھرپور ہوتا ہے جو دل کو تقویت دیتا ہے۔

2۔ انار اور پودینہ سے بنا فلیورڈ پانی کے اجزا

انار۔ ایک چوتھائی کپ، پودینہ کے پتے۔ ایک مٹھی پانی۔ ایک لیٹر

ترکیب: انار کے دانوں کو ہلکا سا کوٹ لیں۔ پودینہ کے پتوں کو ہاتھ سے توڑ لیں۔ ایک لیٹر پانی کو کسی بوتل میں ڈال کر اس میں انار کے

دانے اور پودینہ کے پتے ڈال دیں اور دو گھنٹے کے لئے فریج میں رکھ دیں۔

فوائد: انار دانہ بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتا ہے اور اینٹی آکسیڈنٹ اور اینٹی کینسر خصوصیات رکھتا ہے۔ پودینہ جسم کو تازگی اور راحت پہنچاتا ہے گرمی میں ہونے والے ہیضہ سے بچاتا ہے اور جسم سے ٹوکسنز باہر نکالتا ہے جس سے وزن کنٹرول میں رہتا ہے۔

3۔ آم اور تلسی کے پتوں سے بنا فلیورڈ پانی کے اجزا

آم کے سلائس۔ دس عدد، تلسی کے پتے۔ دس عدد، پانی۔ ایک لیٹر

ترکیب: آم کے ٹکڑوں کو باریک باریک کاٹ لیں۔ تلسی کے پتوں کو دھو کر توڑ لیں۔ ایک لیٹر پانی کو جگ میں ڈال دیں اس میں آم اور تلسی کے پتے ڈال کر ایک گھنٹے کے لئے فریج میں رکھ دیں۔

فوائد: اس پانی میں موجود آم قوت مدافعت، بلڈ پریشر اور کولیسٹرول کو کنٹرول کرتا ہے، ہاضمہ اور قوت مدافعت بہتر کرتا ہے۔ تلسی کے پتے اینٹی آکسیڈنٹ ہیں جو ٹوکسنز کو باہر نکالتے ہیں اس کے ساتھ چہرے پر بھی چمک لاتے ہیں۔

4۔ سیب اور لیموں سے بنا فلیورڈ پانی کے اجزا

ہرے سیب۔ بارہ ٹکڑے، لیموں کے سلائس۔ سات عدد، پانی۔ ایک لیٹر

ترکیب: سیب کے ٹکڑے اور لیموں کے سلائس باریک باریک کاٹ لیں۔ ایک لیٹر پانی میں لیموں اور سیب کے ٹکڑے ڈال کر ایک گھنٹے کے لئے فریج میں رکھ دیں۔

فوائد: سیب میں فائٹو نیوٹرنٹ پائے جاتے ہیں جو کینسر، استھما، دل کی بیماریوں اور کولیسٹرول جیسے امراض سے بچاتے ہیں۔ لیموں وٹامن سی حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ ہے جو نہ صرف ہاضمہ کو درست کرتا ہے بلکہ ہڈیوں کے درد اور موسمی بخار سے بھی بچاتا ہے۔

5۔ اورنج اور ادرک سے بنا فلیورڈ پانی کے اجزا

کینو۔ آدھا، ادرک۔ ایک انچ کا ٹکڑا، پانی ایک لیٹر

ترکیب: ادرک کو اچھی طرح کوٹ لیں۔ کینو کو باریک سلائس میں کاٹ لیں ک کے سلائس ایک بوتل میں ڈال کر اوپر سے پانی ڈال دیں اور دو گھنٹے کے لئے فریج میں رکھ دیں۔

فوائد: کینو اینٹی آکسیڈنٹ اور وٹامن سی سے بھرپور ہوتے ہیں جو دل کی حفاظت کرتے ہیں اور چہرے کی رنگت بھی صاف کرتے ہیں۔ ادرک پٹھوں کے درد کو دور کرنے اور شوگر کنٹرول کرنے میں انتہائی مفید ہے۔

گرمیوں کے لئے مزیدار اور مختلف رائتے

گرمیاں آتے ہی غذا میں تبدیلی کرنا انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن کچھ ایسی غذائیں ہوتی ہیں جو ہر موسم میں دسترخوان کی زینت بنتی ہیں ان غذاؤں میں رائتہ سرفہرست ہے۔

رائتے کا بنیادی جز دہی ہوتا ہے لیکن ہر گھر میں مختلف سبزیاں اور اجزا شامل کر کے طرح طرح کے رائتے بنائے جاتے ہیں۔

لوکی اور کدو کا رائتہ

اجزا۔ دہی۔ ایک کپ، کدوکش لوکی اور کدو۔ آدھا آدھا کپ، نمک۔ حسب ذائقہ، ہری مرچ۔ چار عدد، ہرا دھنیا اور پودینہ۔ آدھا آدھا کپ، لہسن۔ ایک جوا، زیرہ۔ آدھا چائے کا چمچ، ثابت مرچ۔ چار عدد، تیل۔ چار کھانے کے چمچ

ترکیب: ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ اور لہسن کے جوے کو باریک گرائنڈ کر کے چٹنی بنا لیں، اب دہی کو اچھی طرح پھینٹ کر اس میں کدوکش لوکی اور کدو، نمک اور چٹنی ڈال کر اچھی طرح کانٹے کی مدد سے مکس کر لیں، رائتہ کا بگھار تیار کرنے کے لئے تیل میں ثابت لال مرچ اور زیرہ ڈال کر کڑکڑائیں اور رائتہ پر ڈال دیں۔ گرمیوں کی دوپہر میں اس رائتہ کو روٹی یا زیرہ والے چاول کے ساتھ نوش فرمائیں

جھٹ پٹ، مصالحہ دار رائتہ

اجزا: دہی۔ دو کپ، پیاز۔ ایک چھوٹی، ٹماٹر۔ ایک عدد، لہسن ادرک کا پیسٹ۔ ایک کھانے کا چمچ، بند گوبھی۔ آدھا کپ، ہرا دھنیا پودینہ۔ آدھی آدھی گٹھی، نمک۔ حسب ذائقہ، بھنا کٹا زیرہ۔ آدھا چائے کا چمچ، سرخ مرچ پاؤڈر۔ ایک کھانے کا چمچ، سفید کولڈ ڈرنک۔ چار کھانے کے چمچ، پانی۔ ایک چوتھائی کپ

ترکیب: تمام اجزا کو بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کر لیں، اس رائتے کو آلو کی تہاری، بریانی یا کھچڑی کے ساتھ پیش کریں۔

کیا ہے پولیو اور پولیو ڈوز؟...

اپنے بچے کی حفاظت کیجیے

ریحان انصاری

کن ماں باپ کی خواہش نہیں ہوتی کہ ان کی اولاد بے حد خوبصورت اور خلقی نقائص سے پاک رہے۔ پھر پیدائش کے بعد بھی بچوں کے ساتھ کیسی محبت اور لگاؤ رہتا ہے اور کتنے چاؤ کے ساتھ انھیں پالا پوسا جاتا ہے؛ بچوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جاتا ہے؛ ان کی بھوک، پیاس اور دکھ بیماری سب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی ہنستے کھیلتے اور کلکاریاں مارتے بچے دن بھر کے تھکے ہارے والدین کی تھکان کو بس ایک مسکراہٹ اور ایک کھلکھلاہٹ میں بھلا دیتے ہیں۔ ماں باپ کی دنیا انھیں کی وجہ سے گلشن ہے، انھیں کی وجہ سے روشن ہے۔

مگر ہم سب جانتے ہیں کہ کچھ ماں باپ کی دنیا کے اس سورج کو پولیو نامی بیماری سے گھن لگ جاتا ہے۔ اور ایک بار یہ سورج گھن گیا تو پھر زندگی بھر سکھ کی تان نہیں سنائی دیتی۔ ہر وقت ایک اندھیرا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ بدنصیبی کا اندھیرا۔ اپاہج بچہ... معذور بچہ... دوسروں کا دستِ نگر اور محتاج بچہ... جس بچے کو ماں اور باپ کا سہارا بننا تھا وہی خود سہارے کا محتاج ہو جاتا ہے...!!! زندگی کی یہ کربناک داستان تو کوئی جا کر انھیں سے معلوم کرے جو آج بالغ ہو چکے ہیں مگر بچپن میں جنھیں پولیو نے گھیر لیا تھا۔ ان میں ڈاکٹر بھی ملیں گے، انجینئر بھی پائے جائیں گے، ٹیچر، پروفیسر اور ماہرِ معاشیات بھی ملیں گے، وکیل اور صنعتکار بھی دکھیں گے، کوئی تجارت پیشہ اور دکاندار بھی نظر آئے گا، اپاہجوں کے لیے سرکاری اسکیم سے فائدہ اٹھا کر زندگی گذارنے والے نجی کاروبار کرنے والے افراد بھی... اور ایسے لوگ بھی ملیں گے جو انتہائی محتاج زندگی گذار رہے ہیں... ان سب میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے کہ پولیو زدہ بچہ زندگی میں کیسی ہی تعلیمی یا معاشی ترقی کر لے اس کی شادی بیاہ، اور ازدواجی نیز سماجی زندگی قابلِ رحم ہوتی ہے۔ کیا آپ چاہیں گے کہ آپ کا بچہ پوری زندگی دوسروں کے رحم کے سہارے جیے یا آپ چاہیں گے کہ وہ بااختیار زندگی بسر کرے؛ بیساکھی کے سہارے بچے کو یا بڑے کو چلتے دیکھنا کیا آپ کو اچھا لگے گا؟ پولیو زدہ بچہ اسکول میں بھی اپنے ہم جماعتوں کے درمیان ایک احساسِ کمتری یا احساسِ نقصان کے ساتھ وقت گزارتا ہے، اس کی آنکھوں میں بار بار محرومی اور مایوسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ہم جماعتوں سے مسابقت نہیں کر پاتا۔

اپنے آس پاس ہم ایسے افراد اکثر دیکھتے ہیں جن کا ایک ہاتھ یا پیر دبلا ہوتا ہے، انھیں چلنے یا کام کرنے میں واضح دشواری ہوتی ہے، کبھی سینے کی ہیئت بگڑی ہوتی ہے اور سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے۔ یہ مرض پولیو کا شکار ہیں۔ انھیں بچپن میں پولیو لاحق ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی اب ایک عام مشاہدہ ہو چلا ہے اور خوش کن تبدیلی ہے کہ ایسے افراد اب پسِ شباب یا ادھیڑی کی عمروں میں ہیں۔ بالفاظِ دیگر اب نئے بچوں میں ایسی جسمانی معذوری عموماً

مشاہدہ میں نہیں آتی۔ اس کا سبب بڑے پیمانے پر پولیو کے خلاف ٹیکوں کی مہم کا نتیجہ ہے۔

نامعلوم زمانے سے انسانی آبادی کو متاثر کرنے والے اس مرض کی تفصیلی دریافت انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی۔ اسی لیے پرانی طبی کتابوں میں اس کا تذکرہ بچوں کا لولا پن/ لنگڑا پن/ استرخائے عضلات (عضلات کا ڈھیلا یا کمزور پڑ جانا) جیسے عنوانات کے تحت ملتا ہے۔ ہم نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ اس وقت آبادیاں بہت فاصلوں پر رہتی تھیں اور یہ مرض نوعمر بچوں میں واقع ہوتا ہے اس لیے وبائی تذکروں کی موجودگی نہیں ملتی۔ اکا دکا بچوں کو متاثر پایا جاتا تھا۔ لوگ اسے بدقسمتی اور خلقی کجی پر محمول کرتے تھے۔ جب آبادیاں بڑھیں اور ان کے مابین فاصلے گھٹے تو وبائی دور کا وجود ہوا۔

1949 میں اس کے وائرس کا تفصیلی مطالعہ پیش کرنے پر تھامس ویلر (Thomas Weller) اور رابنس (Robbins) کو نوبل انعام دیا گیا تھا۔ اس مطالعہ کی بنیادی اطلاع وائرس کی دریافت نہیں تھی بلکہ یہ اطلاع تھی کہ پولیو کے وائرس نظام اعصاب کو ضرور متاثر کرتے ہیں لیکن ان کے پلنے بڑھنے (افزائش و اثر پذیری) کا علاقہ غیر اعصابی علاقہ ہے یعنی نظام ہضم و انہضام ہے۔ اسی بنیاد پر ان سے مکمل بچاؤ کی تدبیر بے حد آسان ہوگئی اور ٹیکے تیار کر لیے گئے اور مرض کے پھیلاؤ پر مکمل قابو پانے کی سبیل پیدا ہوگئی۔

1955 میں سالک (Salk) نے پولیو کے خلاف انجکشن والے ٹیکے ایجاد کیے۔ 1957 میں سابن (Sabin) نے پولیو کے قطروں والے ٹیکے ایجاد کیے جسے پلایا جاتا ہے۔ تجربات کے بعد یہی پلانے والے ٹیکے سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔ ہندوستان میں ان ٹیکوں کا پہلا تجربہ 1961 میں آندھرا پردیش میں کیا گیا۔

پولیو

پولیو بہت تیزی سے پھیلنے والا مرض ہے جو آنتوں کو متاثر کرنے والے وائرس (Enterovirus) سے پھیلتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ وائرس آنتوں اور ٹانسل نیز لمفاوی غدود کو متاثر کرتا ہے لیکن وہاں سے خون میں شامل ہو کر نخاع، حرام مغز اور دماغ تک پہنچتا ہے پھر مرض کی علامات ظاہر ہوتی ہیں اور اعصاب و عضلات متاثر ہو جاتے ہیں۔ عضلات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں نیز ان میں ذبول (گھلنا/Atrophy) لاحق ہو جاتا ہے جو غیر رجعی (مستقل) ہوتا ہے۔ یہی مستقل معذوری کا سبب ہے۔ اپاہج بنا دیتا ہے۔

پولیو کے وائرس تین طرح کے ہوتے ہیں، جنھیں ٹائپ ون، ٹائپ ٹو اور ٹائپ تھری کہتے ہیں۔ ان میں پہلی قسم ٹائپ ون کا انفیکشن زیادہ ہوتا ہے (50-60%)۔ دوسری قسم ٹائپ ٹو کا اس سے کم (25-30%) اور تیسری قسم ٹائپ تھری کا سب سے کم (10-15%)۔

پولیو کے وائرس سردانے (Freezing) یا خشکانے (Drying) سے قطعی متاثر نہیں ہوتے بلکہ صفر ڈگری سینٹی گریڈ پر بھی کئی مہینوں تک فعال رہتے ہیں البتہ زیادہ درجۂ حرارت یعنی 55 ڈگری سینٹی گریڈ پر تباہ ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں جراثیم کش پوٹاشیم پرمینگنیٹ کا محلول اور ماورائے بنفشی (الٹرا وائلٹ) شعاعیں اس وائرس کے قاتل کی خصوصیات رکھتے ہیں۔

پولیو وائرس صرف انسانوں میں ملتے ہیں خواہ وہ مریض ہوں یا صحت مند (لیکن وائرس بردار یعنی Carrier)۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وائرس کے پھیلاؤ میں صرف پولیو کے مریض ہی ذمہ دار نہیں ہوتے اور وبا کی صورت میں کون کسے مرض کے حوالے کر دے گا اس کی تحقیق نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی ایسا فرض کیا جاتا ہے کہ "جہاں ایک مریض ہوتا ہے وہاں ایک سو افراد وائرس بردار (مرض کا ذریعہ) ہوتے ہیں۔"

پولیو کے وائرس منہ، حلق اور نظام ہضم کے تمام حصوں میں سکونت رکھتے ہیں۔ وائرس کے پھیلاؤ کا سب سے بڑا ذریعہ انسانی فضلہ (براز) ہے۔ جب کھانے یا پینے کی اشیاء یا ہاتھ اور برتن بھی برازی اجزاء سے ملوث ہو جائیں تو وائرس ان پر منتقل ہو جاتے ہیں اور براہ راست آنتوں میں پہنچ کر مرض کا سبب بنتے ہیں۔ کسی بھی شکل میں ملوث پانی کا استعمال وائرس کو بدن میں منتقل کر دیتا ہے۔

وقوع مرض

پولیو نوعمر بچوں کو شکار کرتا ہے جن میں اسی فیصد بچے تین برس سے کم عمر کے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نوے فیصد بچے پانچ برس سے کم عمر کے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں پولیو کا شکار ہونے والے اکثر بچوں کی عمریں چھ ماہ سے تین برس تک ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں مطالعہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ لڑکے لڑکیوں کی بہ نسبت تین گنا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ موسم کے تعلق سے بھی یہ مطالعہ قابل ذکر ہے کہ اسے بارش اور اس کے قریبی مہینوں سے زیادہ علاقہ ہے اور اس کی وبا عموماً جون تا ستمبر کے مہینوں میں زیادہ پھیلتی ہے۔

پولیو کے وائرس کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ غذائی راستوں میں داخل ہوتے ہیں اور حلق نیز آنتوں میں پلتے بڑھتے ہیں۔ یہاں سے وہ لمفاوی غدود میں پناہ لے کر خون کے ذریعہ نظام اعصاب میں داخل ہوتے ہیں اور اس طرح مرض لاحق ہو جاتا ہے۔

تحفظی تدابیر

تحفظی تدابیر ہی اس مرض کے خلاف مؤثر اقدام ہیں۔ اب تو حکومت خود برسر پیکار ہے اور ٹیکے بلاقیمت لگائے جارہے ہیں۔ اس لیے پانچ برس سے کم عمر کے ہر بچے کو پولیو کا ٹیکہ (دو بوندیں براہِ دہن) دینا اسے پولیو کا شکار ہونے سے بچائے رکھ سکتا ہے۔ اس لیے بچوں کو ٹیکہ دینے میں ہماری ذرا سی بھی غفلت خدانخواستہ اسے زندگی بھر کے لیے اپاہج اور بیساکھیوں کے استعمال پر مجبور کرسکتی ہے۔

پولیو کے ٹیکے پولیو کے ہی کمزور کردہ (Attenuated) وائرس پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جب انھیں پلایا جاتا ہے تو بدن کا دفاعی نظام (مناعت) بیدار ہوتا ہے اس اجنبی وجود کے خلاف اپنا دفاعی دستہ تیار کرتا ہے جنھیں 'اینٹی باڈی' کہا جاتا ہے۔ یہ دفاعی دستے نہ صرف یہ کہ داخل کردہ وائرس کو پہچان کر ختم کردیتے ہیں بلکہ خون میں کافی مدت حتیٰ کہ پوری زندگی کے لیے موجود رہ کر اس مرض سے حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

"یہ پلائے جانے والے قطرات پولیو کے جملہ خطرات سے حفاظت کے ضامن ہیں"۔

اور غور فرمائیے کہ اس میں کتنی آسانی ہے: (1) صرف دو بوند کی مقدار خوراک ہے۔ اور اسے پلانے کے لیے کوئی بہت زیادہ تجربہ کار عملہ بھی درکار نہیں ہوتا۔ (2) آنتوں میں مقامی طور پر بھی اس کی وجہ سے پولیو وائرس کے خلاف دفاعی قوت پیدا ہوجاتی ہے اور خون میں بھی۔ (3) دفاعی اجسام بڑی تیزی کے ساتھ جسم میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ (4) یہ دفاعی اجسام بدن میں تاحیات باقی رہ سکتے ہیں۔ (5) وبائی دور میں سب سے محفوظ ہتھیار ہے۔ (6) بے حد سستا (ارزاں ترین) ٹیکہ ہے۔

حاملہ عورتوں میں بھی (حسبِ ضرورت) بلاتردد استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کوئی واضح خطرات نہیں ہیں۔

چند اہم اور استدلالی باتیں

جیسا کہ پچھلی سطروں میں بتایا گیا کہ ابتدا میں اس ٹیکے کے انجکشن ایجاد ہوئے تھے لیکن بعد کی تحقیقات سے پلانے والے ڈوز (قطرے) بنائے گئے جو زیادہ بہتر اور موثر پائے گئے۔ سالک (Salk) کے ایجاد کردہ انجکشن کے ساتھ ایک اور بات جڑی ہوئی تھی کہ انھیں سائمین (Simian) نوع کے بندروں کے گردے کے اجزا سے تیار کیا گیا تھا اور ان بندروں میں سے کچھ ایک دوسرے وائرس سے متاثر تھے جسے SV40 کہا جاتا ہے۔ اس انجکشن میں یہ وائرس بھی منتقل ہوگئے تھے۔ یہ 1960 کی بات ہے جب امریکہ میں کثیر پیمانے پر امریکی عوام میں پولیو کے خلاف مہم میں اسے استعمال کیا گیا تھا۔ اس وقت یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ امریکہ کی بڑی آبادی کا ایک حصہ اسی SV40 کی وجہ سے کچھ نادر کینسر میں مبتلا ہوئی تھی۔ لیکن اس دعویٰ کو صحیح طور پر ثابت نہیں کیا جاسکا کیونکہ بعد میں تیار کیے جانے والے انجکشن سے اس جز کو پاک کردیا گیا تھا اور مطالعہ نہیں کیا جاسکا۔ پھر جلد ہی جب سابن (Sabin) کے ذریعہ تیار کردہ منہ کے راستے دیئے جانے والے ٹیکے تیار کیے گئے تو یہ بحث ہی بے معنی ہوگئی۔ سینٹر فار ڈیسیز کنٹرول (CDC) کی ویب سائٹ پر موجود اطلاع کے مطابق امریکہ سے پولیو کا مرض ختم ہونے کے بعد اب وہاں اس کے ٹیکوں کی تیاری بھی نہیں ہوتی۔

سابنؔ کے تیار کردہ ٹیکے پولیو کے زندہ وائرس کو لے کر فارمالڈیہائیڈ نامی کیمیاوی محلول میں شامل کردیے جاتے ہیں جہاں ان کی قوت بہت کمزور کردی جاتی ہے۔ اور پھر دوسرے مناسب کیمیاوی محلول میں انھیں محفوظ کردیا جاتا ہے جو پلایا جاسکے۔ اس میں وائرس کے علاوہ اور کوئی دوسرے حیوانی اجزا نہیں پائے جاتے۔ اس مقصد کے لیے ہمارے یہاں ہافکن انسٹی ٹیوٹ انڈونیشیا سے درآمد کردہ OPV کی مدد سے اسے میگنیشیم کلورائیڈ ($MgCl_2$) کے محلول میں اسے معلق کرتے ہیں۔ اب منہ سے دیئے جانے والے انھیں ٹیکوں کو عوامی سطح پر پلایا جاتا ہے جس کی طبی اہمیت اور ضرورت اسی لیے زیادہ ہے کہ ہمارے اور سبھی کے بچے لاچاری و معذوری کی زندگی سے محفوظ رہیں۔

پولیو کے ٹیکے کن لوگوں کو نہیں دینا چاہیے؟

☆ جو شدید متعدی (Infectious) مرض کا شکار ہو۔ ☆ تیز بخار میں مبتلا مریض۔ ☆ اسہال (جلاب) اور تشنج کا شکار۔ ☆ خون کے کینسر (Leukaemia) اور دیگر کینسر کے مریض۔ ☆ ایسے مریض جن کو مناعت (قوتِ دفاع) کو قابو میں کرنے والی دواؤں جیسے کارٹیکوسٹیرائیڈ وغیرہ پر رکھا گیا ہو۔ نیز شدید ترین کہنہ مرض میں مبتلا اشخاص۔

کچھ ہدایات

بچوں کو ٹیکے کے فوراً بعد بھی مائیں اپنا دودھ پلا سکتی ہیں البتہ گرم پانی، گرم دودھ، چائے اور دیگر گرم مشروبات نہیں دینے چاہئیں کیونکہ حرارت پاکر ٹیکہ خراب ہوجاتا ہے۔ گرمی والے مقامات یا بھیڑ بھاڑ والے کمرے میں ٹیکہ نہیں پلانا چاہیے بلکہ کھلی ہوا اور سایہ دار جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ٹیکہ سرد مقام پر یا برف کے ڈبے میں رکھنا چاہیے۔

وبائی دور میں

کسی آبادی میں یا اطراف و جوانب میں اکلوتا کیس بھی پایا گیا تو پورے علاقے کو بیدار ہوجانا چاہیے۔ اور ہر ایسے بچے کو جس کی عمر چھ برس سے کم ہو پولیو کے ٹیکے کی دو بوند ضرور پلانا چاہیے تاکہ عمر بھر کی معذوری سے اسے بچایا جاسکے۔ ایسے بچوں کو بھی ضرور ٹیکہ پلانا چاہیے جسے جلد ہی تمام ٹیکوں کا کورس پورا کرایا گیا ہو۔ اس میں کوئی نقصان کا پہلو نہیں ہے۔ مریض بچے کے براز میں وائرس کی موجودگی کا پتہ لگانے کے لیے جانچ کو بھیجنا لازمی ہے۔ علاوہ ازیں خود مریض کے تعلق سے کوئی بھی مخصوص تشخیصی ٹیسٹ لازمی نہیں ہے۔

پولیوزدہ کے لیے تدابیر

☆ کوئی بدنصیب اگر پولیو کا شکار ہوجائے تو اسے دو سے تین ہفتوں تک یا اس وقت تک بستر پر مکمل آرام دیا جائے جب تک بخار، درد اور عضلات میں اینٹھن کم نہیں ہوجاتی۔ بچے کو بالکل عام حالت میں پیٹھ کے بل لٹائے رکھا جائے ورنہ معذوری یا بدہیئتی بڑھ سکتی ہے۔ متاثرہ بازو یا پیر کو ریت کی تھیلی سے آسرا دیا جائے۔ ہاتھ یا پیر کے لولے پن کو محدود کرنے کے لیے بچوں کو گدے دار تختی کے ساتھ لپیٹ دیا جائے۔ اگر بچے میں کسی شدید تنفسی علامت کا پتہ چلے تو اسے فوری طور پر اسپتال میں منتقل کردیا جائے تاکہ اسے مناسب ترین طبی امداد پہنچائی جاسکے۔

☆ درد کے لیے درد کشا دوائیں اور مسکنات دیے جائیں نیز متاثرہ حصے پر گرم پانی یا جوشاندوں سے سینکا جائے۔ ایسا دن میں تین تا چار مرتبہ کیا جائے اور ہر بار کم از کم پندرہ منٹ تک سینکا جائے۔

☆ ابتدا میں ہلکی غذائیں جو سیال یا نیم سیال ہوں دی جائیں اور قبض سے بچایا جائے۔

☆ ابتدا سے ہی فزیوتھیراپی کی مدد لی جائے اور روزانہ ہلکی مالش اور متاثرہ بازو یا پیر کو جوڑوں پر حرکت کرتے ہوئے کھولا اور بند کیا جائے۔ جب تین یا چار ہفتوں کے بعد یہ واضح ہوجائے کہ مرض کا حملہ ختم ہوچکا ہے تو فوری طور پر ورزش کا بندوبست کرکے مریض کو زیادہ سے زیادہ حرکت دینے کی تدابیر کی جائیں تاکہ معذوری کم سے کم ہوجائے۔ البتہ یہ بات ضرور ذہن نشین رہے کہ پولیوزدہ کو سو فیصد طبعی طاقت نہیں لوٹ سکتی اور کسی نہ کسی مقدار میں معذوری مقدر ہوتی ہے۔

Dr. Rehan Ansari
455, Near City Civil Court
Purani Haveli
Hyderabad-500002

فرہنگ آصفیہ سے

پارس۔ ہ۔ اسم مذکر۔ ایک خیالی پتھر جسے ہندوستان کے لوگ اکسیر کی بجائے خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ پتھر لوہے سے چھو جائے تو اسے سونا بنادے

پارس وہ سنگ ہے جسے ٹھکرائے تو چلے
اکسیر جز ہے تیرے قدم کے غبار کا (ذوق)

(سنگِ پارس کی نسبت اگلے کیمیاگروں کا یہ خیال تھا کہ یہ ایک قسم کا حیوان ہے جسکی شکل پتھر میں منقلب ہو گئی ہے بعض کہتے تھے کہ اس کی ترکیب میں گندھک اور پارہ شامل ہے بعض کا بیان تھا کہ یہ ایک سرخ رنگ اور نرالی بو کا برادہ ہے اور حقیقت میں وہ مکر و فریب کا جعلی پتھر ہوتا تھا جس کی ساخت میں سونا ملا دیتے تھے اور وہ آگ پر رکھنے سے اصلی سونا نکل آتا تھا۔ اہل یورپ بھی ایک مدت تک اس دھوکے میں رہے۔ چنانچہ ہنری ششم نے --- میں ایک کمیشن اس امر کے دریافت کرنے کو مقرر کیا تا کہ یہ نعمت عظمیٰ حاصل کر کے سلطنت کا قرضہ چکائے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ فلی ایک مشہور کیمیاگر نے --- میں اسکے لئے بہت سی خاک چھانی۔ بارہ ابواب اس کی شناخت میں تحریر کئے۔ مگر اخیر کو اپنی تمام تصانیف جھوٹی اور خیالی ثابت کر کے جلادینے کی درخواست کی اور اس لغو حرکت پر ہمیشہ تاسف کرتا رہا۔ فرانس کے کیمیاگروں میں بھی اس کا خوب چرچا رہا لیکن انجام کار وہ بھی ہاتھ اٹھا کر بیٹھ رہے البتہ ہمارا ہندوستان اپنی خوش اعتقادی سے آج تک اس پر مقابو اپیٹھا ہے اور نیپال کے پہاڑوں میں اب بھی منہ سامنے کرکے اسکا پتا بتاتا ہے)۔
(۲۔ صفت) نفیس اور عمدہ مٹھائی جو پتلوں میں پروسی جاتی ہے (۳) نیوو گا۔ تندرست (۴) امر۔ غیر فانی۔

جھریوں سے نجات میں مدد دینے والے قدرتی نسخے

جھریوں سے نجات میں مدد دینے والے قدرتی نسخے

ویسے تو اپنے چہرے پر جھریاں دیکھنا کس کو اچھا لگتا ہوگا؟ خاص طور پر اگر عمر بھی زیادہ نہ ہو یا درمیانی عمر ہو۔

کیا آپ جھریوں کو چھپانے یا ختم کرنے کے لیے مہنگی کریموں اور طبی طریقہ کار کو اپنانا چاہتے ہیں؟

اگر ہاں تو اس سے پہلے ان قدرتی نسخوں کو بھی آزما کر دیکھ لیں ہوسکتا ہے یہ آپ کے لیے کافی موثر ثابت ہوں۔

انڈے کی سفیدی

کسی چھوٹے ڈونگے میں کئی انڈوں کی سفیدی کو مکس کرلیں۔ اس مکسچر کا مساج اپنی جلد پر کریں، اور پھر کم از کم پندرہ منٹ تک خشک ہونے دیں۔ اس کے بعد گرم پانی سے دھولیں اور انڈوں کی سفیدی میں شامل قدرتی وٹامن بی اور وٹامن ای کو جھریوں پر قابو پانے کا کام کرنے دیں۔

زیتون کا تیل

قدرتی زیتون کا تیل آپ کی جلد کو ملائم اور لچکدار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اپنے چہرے پر سونے سے قبل زیتون کے تیل کے چند قطروں کا مساج کریں اور نرم تولیے سے صاف کردیں۔ جب صبح آپ سو کر اٹھیں گے تو جلد نرم اور صحت مند نظر آئے گی۔

مساج

اپنے کسی پسندیدہ لوشن کو لیں، چند منٹ تک اپنے چہرے پر نرمی سے اس کا مساج کریں۔ زیادہ توجہ متاثرہ حصوں جیسے گردن، آنکھوں کے نیچے اور کنپٹی پر دیں۔ اس کا ایک اور علاج بھی ہے یعنی کسی اچھی جگہ سے فیشل کرانا جو فائدہ مند بھی ثابت ہوتا ہے۔

پھل اور سبزیاں

تازہ پھل اور سبزیاں وٹامن اے اور ڈی سے بھرپور ہوتی ہیں جو آپ کی جلد کو گداز بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ جلد چمکنے لگی ہے۔ تازہ پھلوں اور سبزیوں کا جوس خود بنا کر پینے کو عادت بنا کر بھی آپ یہ فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔

لیموں کا عرق

ایک لیموں کے ٹکڑے کریں اور اس کے عرق کا مساج چہرے پر موجود جھریوں پر کریں۔ لیموں میں موجود تیزابیت جلد کو روشن کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے جبکہ جھریوں کا نمایاں ہونا کم ہوجاتا ہے۔

سانس میں بو سے نجات حاصل کرنے کا آسان نسخہ

کیا آپ کو اکثر سانس میں بو کا سامنا ہوتا ہے؟ تو اس کی کئی وجوہات اور عناصر ہوسکتے ہیں اور آپ کی کچھ غلطیاں بھی ہوسکتی ہیں۔

اگر آپ کو اکثر اس مسئلے کا سامنا ہوتا ہے تو پریشان مت ہوں، درحقیقت اس کا بہت آسان اور بہترین علاج موجود ہے، مگر اکثر افراد اس پر توجہ تک نہیں دیتے۔

امریکن ڈینٹل ایسوسی ایشن کے مطابق عام طور پر سانس میں بو جسم میں پانی کی کمی یا ڈی ہائیڈریشن کی علامت ہوتی ہے۔

ایسوسی ایشن کے ترجمان ڈاکٹر ایڈ ایلس کوپر کے مطابق اس غلط فہمی میں مت رہیں کہ روزانہ چار بار ماؤتھ واش کا استعمال کرنا سانس کی بو کا علاج ثابت ہوسکتا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ جب آپ کا منہ زیادہ خشک ہوتا ہے تو اس میں تھوک کم بنتا ہے اور جب لعاب دہن کم ہوتا ہے تو غذائی ٹکڑے اور بیکٹریا زیادہ وقت تک منہ کے اندر موجود رہنے لگتے ہیں۔

اگر اس طرح کی پریشانی کا سامنا تو روزانہ زیادہ مقدار میں پانی پینا اس کا آسان ترین علاج ثابت ہوسکتا ہے جبکہ کافی، الکحل، تمباکو نوشی یا مخصوص ادویات کے حوالے سے خبردار رہنا چاہئے جو منہ کو خشک کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔

ویسے جیسے ذکر کیا جاچکا ہے کہ سانس میں بو کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں جو کہ منہ خشک ہونے یا صفائی نہ کرنے سے ہٹ کر ہوسکتی ہیں۔

ڈاکٹروں کے مطابق ہمیشہ رات کو دانتوں پر برش ضرور کریں کیونکہ وہاں پھنس جانے والے ذرات اور بیکٹریا نیند کے دوران بو پیدا کرسکتے ہیں۔

اگر سانس کی بو سے نجات نہیں مل رہی ہے تو پھر ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے تاکہ اس کی اصل وجہ سامنے آسکے اور پھر اس کے مطابق علاج ممکن ہوسکے۔

آکسیجن خوبصورتی کے لئے بہت ضروری ہے

آکسیجن خون کو صاف اور بدن میں گرمی اور مقناطیس پیدا کرتی ہے، جسم میں حوصلہ اور کام کرنے کی خواہش پیدا کرتی ہے، خون کے اندر جو غلاظت ہوتی ہے اسے جلا کر تندرستی بڑھاتی ہے، اس کی کمی سے خون زرد ہوجاتا ہے اور بدن میں کمزوری پیدا ہوجاتی ہے، جن لوگوں کے بدن میں آکسیجن کم ہوتی ہے وہ جلد متعدی امراض کے شکار ہوجاتے ہیں۔

بدن کو کافی مقدار میں آکسیجن نہ ملنے سے بدن میں سستی آنا شروع ہوجاتی ہے، زکام حملہ آور ہوجاتا ہے اور رفتہ رفتہ زکام سے کھانسی اور کھانسی سے تپ دق آگھیرتی ہے، آکسیجن کی کمی کا نتیجہ دق ہوتا ہے، پھیپھڑے آکسیجن کے بھوکے ہوتے ہیں اسی لیے ڈاکٹر پرانی کھانسی اور تپ دق کے بیماروں کو پہاڑوں پر بھیجتے ہیں کیونکہ وہاں چیڑ کے جنگلوں میں زیادہ آکسیجن ہوتی ہے، سمندر آکسیجن کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔

سمندر کے کنارے رہنا، سمندر کے پانی میں غسل کرنا کمزور چھاتی والوں کے لیے بہت مفید ہے، جو لوگ ہر روز صبح سیر کرتے ہیں، کھلے میدانوں اور پہاڑوں میں وقت گزارتے ہیں، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھتے ہیں اور گہرے سانس لیتے ہیں، وہ زکام کھانسی اور نزلے سے بچے رہتے ہیں۔

آکسیجن مندرجہ ذیل چیزوں میں کافی مقدار میں پائی جاتی ہے ،انگور، سیب، لیموں، سنگترے، سبز مرچ اور پیاز، سمندر اور دریا کے کنارے اور دریائی علاقوں میں، یوکلپٹس، چیڑ، پیپل اور چنار کے درختوں کے نیچے بہت زیادہ مقدار میں ہوتی ہے۔

تاثرات: نگرنگر سے

ایک سہیلی کے ذریعہ خواتین دنیا کا ایک اشتہار واٹس ایپ کے ذریعہ نظر نواز ہوا۔ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ قومی اردو کونسل نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر خواتین کے لیے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا ہے۔ میں مرادآباد میں رہتی ہوں اور بی اے کرنے کے بعد میں نے CABA-MDTP کا کورس آپ کے سینٹر سے کیا ہے۔ وہیں اردو دنیا اور بچوں کی دنیا دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ میں اکثر سوچتی تھی کاش اتنا خوبصورت رسالہ اگر خواتین کا بھی ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی جب میں نے یہ سوچا تھا اور اللہ نے میری سن لی۔ ابھی تک میں نے کوئی رسالہ دیکھا نہیں ہے۔ اشتہار دیکھنے کے بعد خود کو روک نہیں سکی اور آپ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ اگر اس مردوں کے سماج میں کوئی خواتین کے لیے ایک قدم اٹھاتا ہے تو ہمیں اس کا نہ صرف استقبال کرنا چاہیے بلکہ شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے۔

میں نہ ادیبہ ہوں نہ شاعرہ ہاں! ایک اردو کی قاری ضرور ہوں اور مجھے اپنی مادری زبان جب بھی سنوری نظر آتی ہے تو میں سرشار ہو جاتی ہوں۔ میں تصور میں اس رسالے کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اردو کونسل نے 'خواتین دنیا' بھی 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' کے معیار کا ہی نکالا ہوگا۔ میں اس کی سالانہ خریدار بن کر ہر ماہ اس کا خود بھی مطالعہ کروں گی اور اپنی سہیلیوں میں جو اردو جانتی ہیں سے گزارش کروں گی کہ وہ رسالے کی مستقل گاہک بن جائیں۔ رسالے کے ہاتھ آنے کے بعد تفصیلی خط لکھوں گی۔ ایک بار اور مبارک باد قبول کریں۔ شکریہ

تبسم، مرادآباد، یوپی

'خواتین دنیا' کے تازہ شمارے نے بھی ہر بار کی طرح اپنا خاص تاثر چھوڑا۔ آپ کے اداریے تو ذہنی حقیقت کے عکاس ہوتے ہی ہیں، مضامین بھی ایسے ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر معلومات کا ذخیرہ ہاتھ آتا ہے۔ یہ ماہنامہ، خواتین کو ان کے حقوق اور ذمہ داریوں، دونوں کے تئیں بیدار کرتا ہے۔ کام کاجی خواتین کے مسائل اور ان کے سدِ باب پر کوئی کام شروع کر دیں تو آج کی خواتین کے لیے بہت فائدہ بخش رہے گا۔ یوں تو یہ ماہنامہ ہر اعتبار سے مکمل کہا جا سکتا ہے لیکن ابھی کچھ چیزیں ہیں جو ضروری ہیں۔ اگر ان کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ بڑا کام ہوگا۔ نمبر ایک تو یہ کہ اردو سے متعلق مختلف یونیورسٹیوں اور پی جی کالجوں میں اردو کی صورتِ حال پر مضامین ہونے چاہئیں۔ وہاں پر ہونے والے کام کی اصلاح کی راہیں کیا ہو سکتی ہیں، اس بارے میں جانکاری کی ضرورت ہے۔ اردو اداروں کی کارگزاری اور سرگرمی پر بھی اگر مضامین ہوں تو بہت اچھا رہے گا۔ خواتین اسکالرز، جو مختلف دانش گاہوں میں تحقیق کر رہی ہیں ان کے انٹرویو بھی شامل کیے جائیں۔ لیکچرار اور پروفیسر خواتین سے ملاقاتیں بھی ہوں تو اس کی رفعت میں اضافہ ہو جائے گا۔

شگفتہ پروین، گوہاٹی، آسام

آداب عرض! آپ کو خواتین کے لیے رسالہ 'خواتین دنیا' کی اشاعت شروع کرنے پر بہت بہت مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ این۔ سی۔ پی۔ یو۔ ایل۔ کا یہ کام واقعی قابل تعریف ہے اور ان کا شکریہ کرتی ہوں جن کی محنت اور لگن سے یہ رسالہ جاری ہوا ہے۔ آپ میری طرف دلی مبارک باد اور شکریہ کا پیغام پہنچا دیں۔ شکریہ۔

فرحت آرا بیگم، گڑگرام، ہریانہ

مسلسل 6 گھنٹے تک 102 زبانوں میں گانے والی لڑکی نے عالمی ریکارڈ قائم کردیا

دبئی: دبئی میں رہنے والی یہ لڑکی ساتویں جماعت کی طالبہ ہے جس نے حال ہی میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے دو اعزازات اپنے نام کیے ہیں۔ ایک تو اس نے 102 زبانوں میں گانے سنائے اور دوم مسلسل 6 گھنٹے 15 منٹ تک اس نے کنسرٹ میں گانے پیش کیے جو اس کی ہمت اور یادداشت کو ظاہر کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سچترا نے ایک سال قبل اس کی تیاریاں شروع کیں اور مسلسل محنت سے مختلف زبانوں میں گانے یاد کرنے شروع کردیے۔ اس سے قبل وہ کئی بھارتی زبانوں میں گاتی رہی ہیں جن میں ہندی، ملیالم اور تامل کے علاوہ انگریزی زبانیں بھی شامل ہیں۔ 25 جنوری 2018 کو سچترا نے دبئی میں بھارتی سفارت خانے کی ایک تقریب میں اپنے منفرد فن کا مظاہرہ کرکے دنیا بھر کو حیران کردیا اور 102 زبانوں میں 6 گھنٹے 15 منٹ تک گانے گائے۔ ان کا تعلق بھارت میں کرناٹک کے ایک موسیقار گھرانے سے ہے۔ انھوں نے 8 برس سے کلاسیکی موسیقی کا آغاز کیا۔ 2016 میں مختلف زبانوں میں گانے کی مشق شروع کی۔ نومبر 2017 میں سچترا نے جاپانی زبان میں گانا گیا جو انھوں نے اپنے والد کے دوست ایک جاپانی ڈاکٹر سے سیکھا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے عربی میں گانے گائے پھر فلپائنی زبان میں بھی کوشش کی۔ اس کے بعد وہ ہر ہفتے ایک نئی زبان کا گانا سیکھتی رہیں یہاں تک کے ان کی ذہن میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کا خیال آیا۔ سچترا نے بتایا کہ مجھے ایک گانا سیکھنے اور یاد کرنے میں دو گھنٹے لگتے ہیں اور اگر اس کا تلفظ آسان ہو تو صرف آدھے گھنٹے میں بھی گانا یاد ہو جاتا ہے۔ کسی مشکل گانے کو یاد کرنے کے دوران وہ اسے بار بار سنتی ہیں لیکن ان کے مطابق فرانسیسی، ہنگری اور جرمن زبانوں کے گانے یاد رکھنا سب سے مشکل امر ہے اور انھیں یاد کرنے میں کبھی دو دن بھی لگ جاتے ہیں۔ قبل ازیں 2008 میں ایک غزل گائیک ڈاکٹر کیسی راجوسری نواس نے 76 مختلف زبانوں میں گانا گا کر ایک ریکارڈ بنایا تھا جس کے بعد انھوں نے 85 زبانوں میں گیت پیش کیا تھا تاہم سچترا نے مسلسل محنت سے یہ ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ رومانیہ کی ایک گلوکارہ اینڈرے گوگن نے مسلسل 3 گھنٹے اور 20 منٹ تک گانا گایا تھا جو ایک ریکارڈ تھا اور سچترا نے اسے بھی توڑ ڈالا ہے۔

سچترا جن زبانوں میں بہ آسانی گانا گاتی ہیں ان میں سنسکرت، البانوی، آسامی، آذربائیجانی، بڈاگو، بلوچی، باسک، بیلاروسی، میتھلی، افریقی، بنگالی، بھوجپوری، بھوٹانی، بلغارین، کیٹولینس، چیک، ڈینش، دھیوہی، ڈوگری، ولندیزی، انگریزی، ایسٹونین، فنش، فرنچ، گڑھوالی، جرمن، یونانی، گورانی، گجراتی، کیبورک، کونکانی، کوریائی، مادری، مراٹھی، نیپالی، نارویجین، ملاگاسی، ملائی، مالٹیز، کیوشیا، راجستھانی، روسی، سربیائی، سندھی، سنالی، سلواکی، سلووینین، صومالی، سویڈش، تاگلوک، تاجک، تامل، تھائی، تنجی، تیلوگو، یوکرینی، ازبک، ویتنامی، ویلش، دوش، یاکوتی، یوربا، زولو، اطالوی، جاپانی، آئس لینڈی، کروزبان، پشتو، ترک، آرمینیائی، ہسپانوی، پرتگالی، اردو، عربی اور ہندی وغیرہ میں شامل ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مغرب میں تنقید کی روایت

مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)

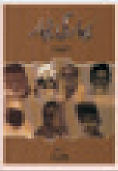

مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

بہار گلشن کشمیر (جلد اوّل و دوم)

مرتبہ و مولف: پنڈت برج کشن کول
و پنڈت جگت موہن ناتھ رینہ
صفحات: 454، 537
قیمت: 275، 300 روپے

دیوندر ستیارتھی

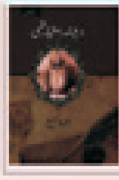

مصنف: عبدالسمیع
صفحات: 162
قیمت: 90 روپے

رشید حسن خاں

مصنف: عبدالحمید
صفحات: 122
قیمت: 74 روپے

سید امتیاز علی تاج

مصنف: محمد شاہد حسین
صفحات: 136
قیمت: 60 روپے

علی سردار جعفری

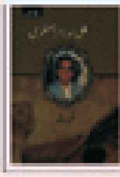

مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90 روپے

یاس یگانہ چنگیزی

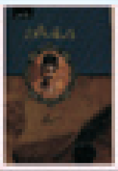

مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 149
قیمت: 90 روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد ششم)

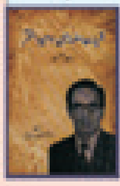

مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: 115/- روپے

آئینۂ جہاں کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم رپورتاژ)

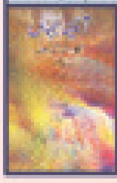

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینۂ جہاں کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم مضامین)

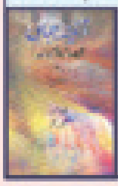

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)

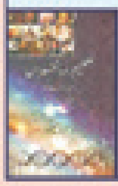

مصنف: اسرار حسین
صفحات: 121
قیمت: 32/- روپے

اسرار کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658)

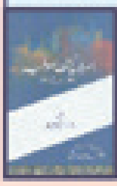

مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
و حواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 603، قیمت: 335/- روپے

انتخاب سخن (جلد اوّل) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: 175/- روپے

دستورِ ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

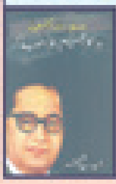

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

داستان گو آیا ہے

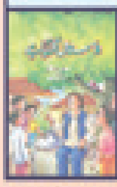

مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجر الدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم

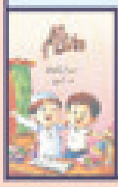

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجر الدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی

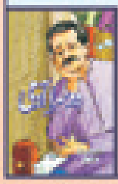

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly March 2018, Vol. 02, Issue: 3 RNI. No. DELURD/2017/74026
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

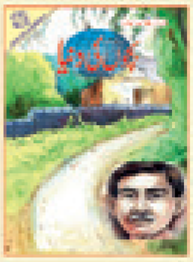

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025